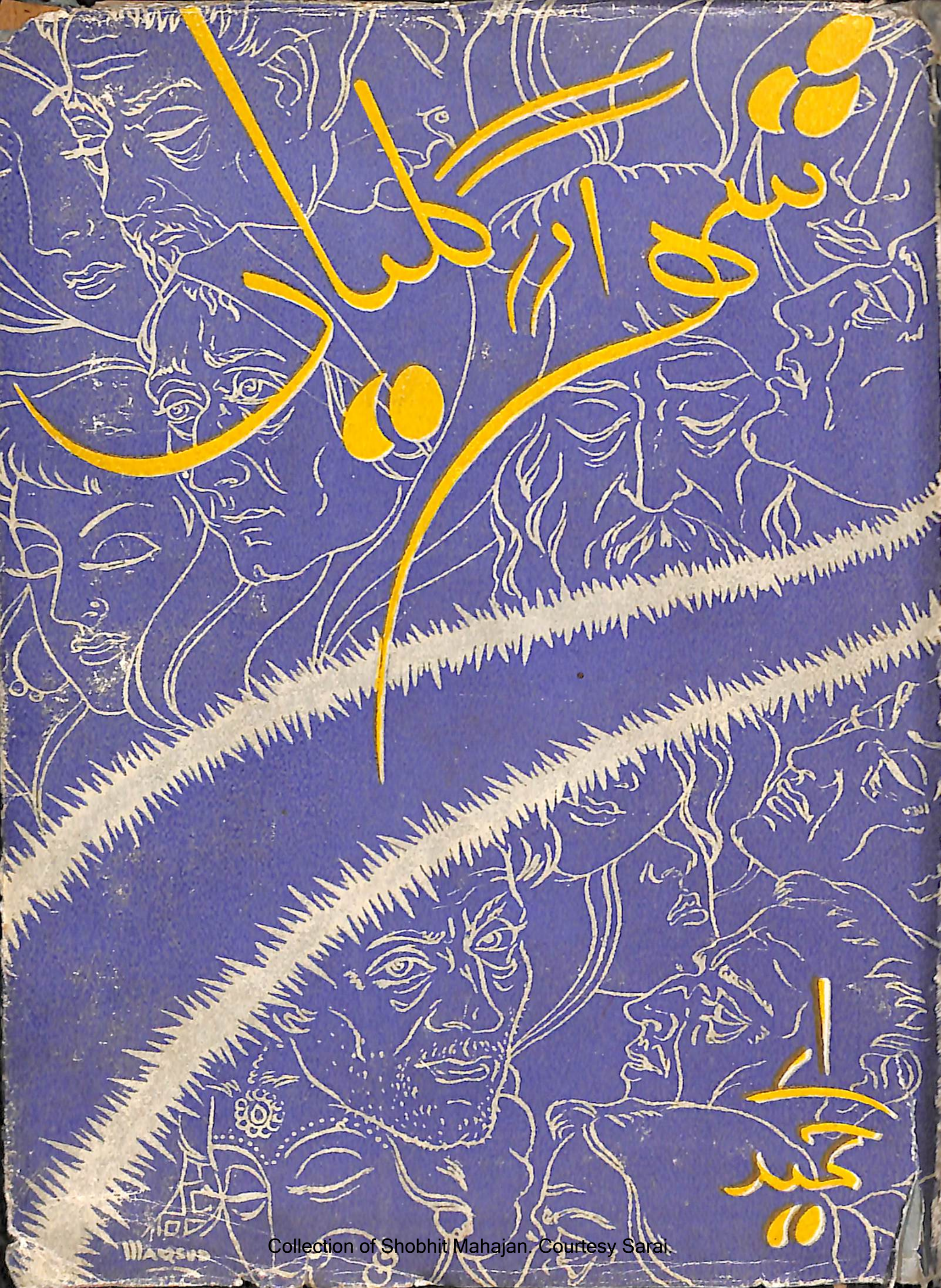

شہر اور گلیاں
اے حمید

کتب بینی
سب سے
بڑی عبادت
ہے۔ اور
ماحول سب
سے بڑا معلم

اے حمید

شہر اور گلیاں

ناول

گوشۂ ادب، چوک انارکلی لاہور

باراوّل تعداد ایک ہزار
قیمت ۳ روپے ۸ر

(انشا پریس، لاہور میں طبع ہوا)

زرد چاند میں رہنے والی اُداس لڑکی
میں تمہاری ڈائری کے یہ پریشان اوراق
تمہارے ہی نام معنون کرتا ہوں۔

اس وقت میں چپ ہوں۔ خاموش ہوں۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے کسی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے قوتِ گویائی چھین لی ہے۔ جیسے یہ ہونٹ زنگ آلود قلعے کے دروازے کی مانند بند ہو چکے ہیں۔ اور اب کبھی نہ کھلیں گے۔ میری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اور میرے دل کا ہر درد جاگ اٹھا ہے ہر زخم رِس رہا ہے۔ اور ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔ اور میں پاگلوں کی طرح کھوئے کھوئے قدم اٹھائے اِس ویران اور خاموش پگڈنڈی پر چلی جا رہی ہوں۔ یہ پگڈنڈی دونوں طرف سے درختوں سے گھری ہوئی ہے۔ اور ٹہنیاں سر جھکائے چُپ چاپ سوچ رہی ہیں۔ آج ہر جانی پہچانی چیز اجنبی نظر آ رہی ہے۔ یہ وہی راستے ہیں جہاں سے میں روزانہ گزرا کرتی

ہوں۔ یہ وہی پہاڑ ہیں۔ جو مہربان محافظوں کی طرح سینہ تانے کھڑے
روزانہ راستے میں مجھے ملا کرتے تھے۔ مگر آج میں ان کو قطعاً نہیں
پہچان رہی۔ یہ آبشار جو کل تک میٹھے میٹھے راگوں سے بھرپور تھا۔ آج اپنا
سر پتھروں سے کیوں پٹخ رہا ہے۔ وہ شفقتی ــــ زمرّدی ــــ نارنجی ــــ
فیروزی، کاسنی اور سرمئی رنگ کے بادل یہاں سے چلے گئے ــــ
لیکن وادیوں میں اُتر گئے! وہ رنگ یہاں اڑ گئے۔ وہ سورج یہاں
ڈوب گیا ہے ــــ جو کل تک آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ یہ ایک
ہی دن میں کیا ہو گیا ہے۔ وہ دلکشی، وہ رعنائی کہاں کھو گئی! ــــ
زندگی کی چمک ــــ روشنی ــــ اور رسیلا پن کیوں مٹ گیا! وہ سارا
حسن کہاں مر گیا! ــــ کیسی موت مر گیا!! ــــ

سارے گھر والے مزے سے اپنے اپنے کاموں میں محو ہیں۔

بھیّا اپنے کمرہ میں بیٹھے ستار پر کوئی دھن چھیڑ رہے ہیں۔

باجی اپنی قوسِ قزح کے رنگ کی قمیص پر استری کر رہی ہے
وہ ساتھ ساتھ اپنے آپ مسکراتی بھی جاتی ہے۔ اور استری بھی کرتی
جاتی ہے۔

باجی بڑی خوش ہے۔ آج باجی اپنے منگیتر ظفر بھیا کے ساتھ سنیما دیکھنے جا رہی ہے۔ دونوں روزانہ جاتے ہیں۔ کبھی سیر کو۔ کبھی سینما کبھی شاپنگ کبھی کسی پارٹی پر، کبھی پکنک پر —— دونوں ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے ہیں —— دولت نے دولت کو گلے لگایا ہوا ہے۔ ورنہ یہ کبھی پیار نہ کر سکتے۔ اگر ظفر بھیا کی ۷۰۰ روپے تنخواہ نہ ہوتی۔ اور کار اور کوٹھی اور بنک بیلنس نہ ہوتا۔ تو یہ منگنی کبھی نہ ہو سکتی۔ یہ سینما دیکھنے کبھی نہ جا سکتے —— یہ ایک دوسرے سے کبھی نہ مل سکتے۔ پھر ایک دوسرے سے ملنے کے لئے انہیں آگ۔ اور خون کا سمندر تیرنا پڑتا۔ اور ان کے چہرے زرد ہوتے۔ لیکن ہائے بیچارا جلیل! —— وہ باجی پر کس قدر مرتا تھا —— لیکن وہ باجی کو کبھی نہ پا سکے گا۔ وہ باجی کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا —— اس لئے کہ وہ غریب ہے۔

اور غریبی دنیا میں انتہائی خوفناک اور بری چیز ہے۔

دادی اماں کی ایرانی بلی مزے سے صوفے پر سو رہی ہے اور ہماری بوڑھی نوکرانی دروازے کے پاس فرش پر اونگھ رہی ہے۔ غزالہ اور نیلوفر کے کمرہ سے ریڈیو سیلون کی آواز آ رہی ہے بھنا نعمان

اور بے بی سلمیٰ بھیا کے کمرہ سے چُرائے ہوئے رسالوں میں سے موٹے موٹے بچوں۔ بلیوں اور طوطوں کی تصویریں کاٹ رہے ہیں۔ ہر ایک ہنس رہا ہے۔ ہر ایک خوش ہے۔

لیکن مجھے چین اور سکون نہیں ہے۔ میرا دل ایک لمحہ کیلئے بھی اِن کے پاس بیٹھنے کو نہیں چاہ رہا۔ اور میں گھبرا کر باہر نکل آئی ہوں۔

جب آنکھوں میں آنسو ہوں۔ اور دل درد سے بھرا ہُوا ہو۔ تو ساری دنیا اُداس اور تاریک نظر آتی ہے۔ اُس وقت صرف تنہائی ہی ہوتی ہے۔ اور اچھی لگتی ہے۔ اور تسلّی دیتی ہے۔ اور ہر درد کو سنتی ہے۔

میں چلتے چلتے بڑی مشکل سے چیڑ کے ان گھنے درختوں تلے آ پہنچی ہوں۔ اور چپ چاپ پاگلوں کی طرح سامنے والی پگڈنڈی کو دیکھ رہی ہوں۔ ساری وادی تاریک نظر آ رہی ہے۔

میری پیاری سہیلی! میری بدنصیب زاہدہ! آج تیری حالت نے مجھے شعلے کی طرح مضطرب کر دیا ہے۔

اُف لاپرواہ پاگل لڑکی! تو نے کتنی بے دردی سے اپنی زندگی کو جلا ڈالا ہے۔ اور آج تُو اکیلی سینی ٹوریم کی اِس سرد، تاریک اور ویران تنہائی میں دم توڑ رہی ہے۔ مر رہی ہے ــــ

تُو یونہی مر جائے گی۔ یونہی ایک خون ہو جائے گا۔ ایک جان چلی جائے گی۔ ایک قیمتی اور پیاری زندگی برباد ہو جائے گی۔ اور کسی کو علم نہ ہوگا۔ کوئی جان نہ سکے گا۔ کچھ نہ ہوگا ــــ

کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سورج یونہی طلوع و غروب ہوتا رہے گا پھول یونہی مرجھا کر تازہ ہوتے رہیں گے۔ ہزاروں لڑکیاں محبت کریں گی۔ مگر زاہدہ دوبارہ واپس نہ آئے گی۔ کچلی ہوئی محبت میں کبھی زندگی پیدا نہ ہوگی۔ شاخ سے ٹوٹا ہوا پھول اور کمان سے نکلا ہوا تیر کبھی واپس نہیں جائے گا۔

لیکن زاہدہ! آج تیرے چہرہ پر کس قدر سکون ہے۔ ایسا سکون تو بچپن میں بھی کبھی تمہارے چہرہ پر نہیں تھا۔ تو اب کیسے اتنی مطمئن ہو گئی ہے! تیرے ساکت اور منجمد لبوں پر آج زندگی کی کوئی تلخی اور شکایت نہیں ہے۔ تجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ تیرے ہونٹوں پر دُکھ درد

کی کوئی سسکی نہیں ہے۔ زندگی ٹھٹھر کر سینے کی قبر میں دفن ہو چکی ہے۔

اور تو سینی ٹوریم کی اندھی تنہائی میں اطمینان سے لیٹی دُنیا کو اُس راہبہ کی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ جو ہر چیز کی حقیقت کو پہنچ چکی ہو۔ تیری پہلی موت سے لے کر اب تک تجھے سکون حاصل نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب تو ایسی آخری موت مر رہی ہے۔ جس کے بعد تجھے کوئی دُکھ نہیں ملے گا۔ خوف وسکون ملے گا۔ زندگی نہیں ملے گی صرف موت ملے گی۔ سرد اور سیاہ موت!

اور پھر تم نے زندگی کو کرنا بھی کیا ہے؟ زندگی نے تمہیں دیا ہی کیا ہے۔ جس کے چھن جانے کا تمہیں افسوس ہوگا، تیرے لئے تو موت زندگی کا پیام ہے۔

اف زاہدہ! موت، کا استقبال یوں سکون اور اطمینان سے کرنا۔ یہ نہ جانے کن لوگوں کا حصّہ ہے۔ یہ تم جیسے لوگوں کا حصّہ ہے یہ بدنصیب دکھی روحوں کا حصّہ ہے۔ سچائی کی پرستار روح کا حصّہ ہے۔ جن لوگوں کو زندگی دکھوں کے سوا کچھ نہیں دیتی۔ ان کے لئے

موت خوشی کا پیغام لاتی ہے۔ جیسے ایک مدت کا بچھڑا ہوا بچہ
اچانک اپنی ماں سے جا ملے!

میری بدنصیب زاہدہ! میری غریب سہیلی! میں تمہارے لئے
کچھ نہ کر سکی —— میں تمہارے لئے کچھ نہ کر سکوں گی —— اور
تمہیں یونہی چپ چاپ مرتے ہوئے دیکھوں گی ——

دیکھو! میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میرا دل پگھل کر
میری آنکھوں میں آ رہا ہے۔

اچھی زاہدہ! کیا آج پچ مچ مَیں نے تمہیں ہی دیکھا تھا! لیکن
سچ مچ تم وہی زاہدہ ہونا۔ جس کی گہری اور شفاف خوبصورت آنکھوں
میں زندگی سورج بن کر جھانکا کرتی تھی۔ اور جس کے معصوم بھولے
بھالے چہرے پر فرشتوں کی سی پاکیزگی تھی۔

لیکن نہیں۔ وہ زاہدہ آج کہیں نظر نہیں آ رہی۔ آج تو زندگی
کی راہ پر کوئی بھٹکی ہوئی دُکھی روح نظر آتی ہے۔ جس کے اردگرد
دُور دُور تک روشنی کا کہیں نام و نشان نہیں۔ صرف اندھیرے کے
صحرا پھیلے ہوئے ہیں۔

آؤ اچھی زاہدہ! آؤ ہم اُس پیاری لڑکی زاہدہ کو دوبارہ کہیں ڈھونڈھیں۔ جسے میں کبھی نہ بھلا سکوں گی۔ اس معصوم اور پیاری زاہدہ کو ڈھونڈیں۔

تب تم ہمارے اسکول میں نئی نئی داخل ہوئی تھیں۔ اور تم سارا دن چپ چاپ اور اداس چہرہ لئے آخری سیٹ پر بیٹھی رہتی تھیں تمہاری کوئی سہیلی نہیں تھی۔ اور تم اپنا بھولا بھالا غمگین چہرہ اوپر اٹھائے سب کو دیکھتی رہتی تھیں۔ یونہی دو تین مہینے گزر گئے۔ اور جب امتحان ہوا تم فرسٹ آ گئیں۔ تو ہر لڑکی نے تمہیں چونک کر دیکھا۔ تو پھر بہت سی لڑکیاں تمہارے قریب آ گئیں۔ اور تم میں دلچسپی لینے لگیں۔ انہیں میں ایک میں بھی تھی۔ اُستانیاں تمہاری بہت تعریف کیا کرتی تھیں۔

اور پھر آہستہ آہستہ اِسی طرح میں تمہارے بہت قریب آتی گئی۔ مجھے دیکھ کر تمہارا اداس سا چہرہ کھل اُٹھتا تھا۔ جیسے موتیے کے پھول کو چاندنی میں نہلا دیا گیا ہو۔

ایک روز کلاس میں ٹسٹ تھا۔ اور تمہارے پاس نہ پنسل تھی اور

تھیں ۔ اور تم پریشان سی ہو گئی تھیں ۔کسی سے مانگنے کی تم میں جرأت
نہیں تھی ۔ اور تم نے سب کو ایک نظر سے دیکھا ۔ اور میری طرف دیکھ
کر تمہیں نہ جانے کیوں جیسے کچھ سہارا ہو گیا ۔ اور میں نے ڈھک سے
دوسرا پن نکال کر اُسی وقت تمہیں دے دیا ۔ پہلے تم لینے سے ہچکچائیں
اور مجھے انتہائی احسان مند نظروں سے دیکھا ۔ لیکن پھر تم نے جلدی سے
پن لے کر کام کرنا شروع کر دیا تھا ۔

حالانکہ مجھے تُم سے ہمیشہ گلہ رہا ۔ مگر تم نے اِس مہربانی کو کبھی
فراموش نہ کیا ۔

تم ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے ظالم دادا ۔ بوڑھی والدہ
اور ایک چھوٹے بھائی اور ایک چھوٹی بہن کے ساتھ شہر کے تنگ
و تاریک محلے میں رہا کرتی تھیں ۔ ہم سے اپنی بوڑھی ماں کو محنت
و مشقت کرتے نہیں دیکھا جاتا تھا ۔ جو ۳۵ سال کی عمر میں ہی سفید
بالوں والا سر لیے ۶۰ سال کی بوڑھی عورت معلوم ہوتی تھی ۔ تمہارا
دادا بڑا ظالم شخص تھا ۔ جو تمہاری پڑھائی کے سراسر خلاف تھا ۔ مگر تم
کسی نہ کسی طرح پڑھ ہی رہی تھیں ۔ تم بہت جلد پڑھ لکھ کر استانی

بن جانا چاہتی تھیں - اور پھر تمہارا ننھا سا خیال تھا - کہ تم اپنے چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کو بہت اعلیٰ تعلیم دلاؤ گی - اور یوں تم لوگوں کے اچھے دن آجائیں گے - اور تم لوگ آسودہ اور خوشحال زندگی گزار سکو گی - اور تمہاری یہ بہت بڑی خواہش تھی - کہ اس کے بعد تم ساری دنیا کے سفر کو جاؤ گی - تم مجھے بتایا کرتی تھیں - کہ تمہیں دنیا کو دیکھنے کا بے حد ارمان ہے - اور تم اُس وقت تک کبھی نہیں مرو گی - جب تک کہ تم ساری دنیا کو نہ دیکھ لو گی - تم نے اپنے پاس کچھ خوب صورت سینریاں رکھی ہوئی تھیں - جو تمہارا سب سے قیمتی سرمایہ تھا - اُس میں ایک تصویر دریائے نیل کی تھی - اور تمہیں مصر جا کر دریائے نیل دیکھنے کی کس قدر آرزو تھی ! —— یہ کوئی تم سے پوچھتا - اور میں تمہیں ہمیشہ یقین دلایا کرتی تھی - کہ ہم دونوں اکٹھی جائیں گی -

مگر تم ہمیشہ یہ سارا کچھ کہہ کر اُداس ہو جایا کرتیں - تمہیں پتہ تھا کہ یہ صرف خواب ہی ہے - کہاں بمشکل تمام دو وقت کی روٹی - اور کہاں دریائے نیل کی سیر - لیکن میں اس خواہش کا ہمیشہ احترام کیا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی - کہ میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی - میرے ڈیڈی

نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے۔ کہ وہ مجھے سمندر پار کے تمام شہر دکھائیں گے۔ اور تم یہ چپ ہو جایا کرو بس۔

اچھی زاہدہ! تم نے تو ابھی ساری دنیا کی سیر کرنی تھی۔ اور سارے خاندان کو اعلیٰ تعلیم دلانی تھی۔ مگر یہ ۴ سالوں میں ہی کایا کیسے پلٹ گئی!!

آج نہ تمہاری والدہ زندہ ہے۔ نہ دادا۔ اور تمہارا چھوٹا بھائی اور تمہاری پیاری بہن جسے تم نے لیڈی ڈاکٹر بنانا تھا۔ وہ رشتے کی ایک خالہ کے ہاں رہتے ہیں۔ جہاں سارا دن گھر کا کام کرتے رہتے ہیں۔ تب کہیں جا کر اُن کو روٹی ملتی ہے۔

زاہدہ! کیا تمہیں اُن کا بھی کوئی خیال نہیں!!

تمہاری زندگی میں ایسا کون ظالم اور بے رحم شخص داخل ہوا جس نے آنِ واحد میں نو خیز کونپلوں کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ ایسی کونسی آندھی چلی۔ جس نے سارے چمن کو اجاڑ کر رکھ دیا۔

تمہاری زندگی کا سورج وقت سے بہت پہلے کیوں ڈوب گیا؟ صبح سویرے یہ کیسی کالی رات ہے۔ جو تمہارے چاروں طرف پھیل گئی

ہے ، پھیل رہی ہے —— اور تمہیں نگل رہی ہے۔

اِن سالوں میں تمہاری دنیا بسی بھی اور اجڑی بھی۔

اور زاہدہ! میں نے تمہیں اپنی دوست کہا۔ اپنی بہن کہا۔ اپنی سہیلی کہا۔ اور پھر تمہاری کوئی خبر نہ لی۔ کوئی حال نہ پوچھا۔ میں اِن ۴ سالوں میں تم سے بہت دُور ہو گئی تھی۔

کاش! میں دُور نہ جاتی —— تو تمہاری دنیا کو اُجڑنے سے ضرور بچا لیتی۔ کچھ تو کرتی۔

آج میں اپنا پشیمان چہرہ لئے یہاں بیٹھی ہوں ——

وقت گزر رہا ہے —— اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے میرا دل ویران سے ویران تر ہوتا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں! گھر والے مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے! اور میں یہاں اتنی دُور، اتنی اونچی چوٹی پر کب سے تنہا بیٹھی ہوں ——

یہاں کتنی بلندی اور رفعت ہے۔ اگر یہاں سے کوئی گر سے۔ تو اُس کی ہڈی پسلی سُرمہ ہو جائے — تُو بھی پتہ نہیں کس بلندی سے گری ہے! کہاں سے گری ہے!!

تجھے گرانے والا کون ہے؟ کہاں ہے؟؟ ——

اُس نے تجھ سے کیسا بدلہ لیا ہے؟؟ ——

تُو نے اُس کا کیا بگاڑا تھا؟؟ ——

وہ مجھے مل جائے ۔ پھر دیکھنا ۔ کہ میں اُس کا کیا حال نہیں کرتی میں تمہارے کسی کام نہیں آسکی ۔

زاہدہ! مگر اتنا وعدہ کرتی ہوں ۔ کہ اگر وہ مجھے اِس زندگی میں کہیں مل گیا ۔ تو تیرے سارے بدلے چکا دوں گی ۔ ضرور چکاؤں گی ۔ مجھے اب کوٹھی واپس چلنا چاہیئے ؛

آج بہت دنوں کے بعد آنکھ کھولی ہے مسلسل پندرہ روز تک بخار آتا رہا ہے۔ کمزوری کتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ بڑی مشکل سے بیٹھی ہوں جس دن سے زاہدہ کی موت کی خبر سنی ہے۔ اور اُس کا خط پڑھا ہے۔ جو معہ ایک بنڈل کے ملا تھا۔ اُس دن کے بعد سے پھر ہوش نہیں رہی۔ آج دل کچھ آرام اور سکون پر ہے۔ اور بخار بھی نہیں ہے۔

سارے گھر والے پریشان تھے۔ ڈیڈی کو باہر دورے پر جانا تھا مگر میری وجہ سے وہ بھی نہیں گئے۔ وہ انتہائی طور پر فکر مند تھے

امی سارا سارا وقت میرے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ باجی اور ظفر بھیا دونوں چپ چپ سے ہو گئے تھے۔ ان کے پروگرام بنتے کے بنتے رہ گئے تھے۔

اِن سب گھر والوں کو میرے اپنے گھر والوں کو میرا کس قدر خیال ہے اپنی بیٹی سے کتنا پیار ہے۔

مگر زاہدہ! تیرا خیال کرنے والا اِس بھری دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا۔ تو اکیلی مر گئی۔ مرتے وقت بھی تیرے پاس کوئی نہیں تھا۔ پتہ نہیں تو ایسے لمحول میں کیا سوچتی ہو گی! تیری سوچیں دہکتا ہوا انگارہ ہونگی۔ جنہوں نے تمہیں جلا کر راکھ کر ڈالا۔

زاہدہ! تیرا خط اور خط کے ساتھ یہ چھوٹا سا بنڈل میرے سامنے میز پہ پڑا ہے۔ تیرا خط پڑھتی ہوں تو بنڈل کو کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ تم نے لکھا ہے:۔

پیاری نجمہ! پرسوں تمہیں دیکھا۔ ایک طویل مدت کے بعد تمہیں اچانک دیکھا۔ تم میری اُس آخری خوشی کا کبھی اندازہ نہ لگا سکو گی۔ جو تمہارے مہربان اور پیارے چہرے کو دیکھ کر مجھے حاصل ہوئی۔ زندگی تمہارے

لیے کتنا خوبصورت اور آسودہ خواب ہے۔ خدا کرے۔ تم ساری
زندگی اِسی خواب کی چھاؤں تلے آرام سے بسر کر سکو!

میں مر رہی ہوں۔ اور میری زندگی کے چند سانس باقی رہ گئے
ہیں۔ پھر میں اِس دنیا میں کبھی واپس نہ آؤں گی۔ نہ تمہارا پیارا چہرہ
دیکھ سکوں گی۔ نہ نیلا آسمان۔ نہ درخت۔ نہ اپنے چھوٹے بہن بھائی
جو یہاں سے بہت دُور دشتے کی خالہ کے پاس بیٹھے ہیں۔ وقت نہ
جانے کیا کر رہے ہوں گے۔ خدا جانے اُن کا کیا حال ہے! ــ خالہ
جب میرے سامنے اُن کو مارنے سے فرق نہ کرتی تھیں۔ تو اب اُن
کا کیا نہ حال ہوتا ہوگا۔ نجمہ! یہ خیال، یہ سوچ۔ یہ تصوّر، مجھے شاید قبر میں
بھی چین سے نہ لیٹنے دے گا۔

کاش! وہ دونوں بھی میرے سامنے مر جاتے۔ تو اچھا تھا۔
کتنا اچھا تھا۔ موت ہم لوگوں کے لئے زندگی سے زیادہ اچھی ہوتی ہے
مجھ سے زیادہ باتیں نہ ہو سکیں گی نجمہ! کھانسی رُکنے کا نام نہیں
لے رہی۔ مگر میں تمہیں لکھتی جاؤں گی۔ رات ہولے ہولے بیت رہی ہے
یوں لگتا ہے۔ جیسے آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔

اے دکھوں سے بھری ہوئی لمبی۔ کالی اور پریشان رات! تیرا دل کس خیال سے آزاد ہو کر دھڑک رہا ہے ٹھٹھر رہا ہے۔ تو کیوں نہیں خوشی سے بھاگ کر گزر جاتی! تیرا ایک ایک قدم غم سے بوجھل اور نڈھال کیوں ہو رہا ہے! کیا تیری بھی کوئی بہن اور بھائی تجھ سے کہیں بہت دُور بیٹھے بے کسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں! آج تو مجھے آخری بار اِس بستر پہ دیکھ رہی ہے۔ کل تو مجھے قبر میں دیکھے گی۔

رات کی سرد ہواؤ! میرا پیار میری بہن نسیمہ اور میرے بھائی انجم کے لئے لے جاؤ۔ میری امی کی قبر پر جا کر بوسہ دو۔

اے آسمان کی پیشانی پر چمکنے والے ستارو! میری زندگی ختم ہو رہی ہے۔ مگر تم "اُسے" کبھی نہ بتانا۔ کہ وہ زاہدہ آج مر گئی۔ جسے تُو نے اپنا کہا تھا۔ اور زندگی بھر ساتھ نبھاہنے کا وعدہ کیا تھا۔

میری سہیلی نجمہ! خط کے ساتھ یہ چھوٹا سا بنڈل بھی تمہیں بھیج رہی ہوں۔ اِس میں میرے کچھ خط۔ اُس کے خط۔ میری ڈائریاں۔ کچھ یادیں اور کچھ اداسیاں بھری ہوئی ہیں۔ تم اِن سب کو رکھ لو۔ اور اگر کبھی تمہیں اِس دنیا میں "وہ" کہیں مل جائے۔ تو اُسے کبھی نہ بتانا۔ کہ زاہدہ مر چکی

ہے۔ اُسے کبھی نہ بتانا۔ کہ زاہدہ تو اُسی روز مر گئی تھی جس دن اُس نے
اُسے چھوڑ کر اپنی پھوپھی کی لڑکی ثمینہ سے شادی کر لی تھی۔ تم وعدہ
کرو کہ تم کبھی اُسے نہیں بتاؤ گی۔ میری اِن سب یادوں کو پڑھنے کے
بعد جلا کر راکھ کر دینا۔ میں جیتے جی اِن کو راکھ میں تبدیل نہ کر سکی۔ خود
راکھ ہو گئی۔ مگر تم میرے مرنے کے بعد اِن کو راکھ میں بدل دینا۔ تاکہ
ہم ایک ہو جائیں۔

اور نجمہ! میری سہیلی! وعدہ کرو۔ تم نسیمہ اور انجم کی زندگی کا میرے
بعد ضرور خیال رکھو گی! اب الوداع میری دوست!

۲۵ر نومبر:۔

آج اسکول میں ہم سب لڑکیاں بہت ہنستی رہیں ۔ بہت دنوں کے
بعد ہنسی میرے لبوں تک آئی تھی ۔ مجھے ہنستے ہوئے بڑا ڈر لگا کرتا ہے
ہنسی اور خوشی ہماری قسمت میں کہاں ہے ؟ لیکن پھر بھی جب منوّر، ثریا
عشرت اور زرینہ نے لطیفے سنائے۔ نقلیں اتاریں اور خوب خوب ایکٹنگ
کی ۔ تو ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا ۔ اور ہنسنے سے کچھ دیر پہلے جو مجھے
سردی لگ رہی تھی ۔ وہ دُور ہو گئی ۔ یہ تو فائدہ مند ہنسی ثابت ہوئی
سردی کتنی زیادہ بڑھ رہی ہے۔ مگر میرے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں ہے

صرف ایک سویٹر ہے۔ لڑکیوں کے پاس کتنے خوبصورت سویٹر اور کوٹ ہیں۔ مگر ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ آج صبح عشرت مجھے کہہ رہی تھی۔ زاہدہ! تم گرم چادر لے کر کیوں نہیں آتیں! کیا تمہیں سردی نہیں لگتی۔ اور میں نے ہنستے ہوئے اُسے کہا تھا۔

نہیں ہے کوٹ کی حاجت نہیں ہے

کہ میں جلوے سے گرمائی گئی ہوں!

اور وہ ہنس دی تھی۔ میں بھی ہنس دی تھی۔ میں تو اب بھی ہنس رہی ہوں لیکن اس میری ہنسی میں وہ جھنکار اور موسیقی کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اکثر ہنسی کی اِس آواز سے ڈر ہی لگتا ہے۔ لیکن اور لڑکیاں تو بڑی پیاری آواز سے ہنستی ہیں۔ مجھے تو اپنی ہنسی پر ہمیشہ یہی گمان ہوا ہے کہ جیسے ظالم اور بے رحم مالک کے چینی کے برتن اٹھا کر لے جا رہی تھی۔ کہ چھن سے ٹوٹ گئے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا ہے؟ اور دل خوف سے دھڑکنے لگتا ہے۔

آج بھی سارا دن ہنستی رہی۔ تین بجے چھٹی ہوئی۔ اور میں گھر آئی ابھی سیڑھیوں ہی میں تھی۔ کہ اُدھر سے دادا جان کے گرجنے کی آواز

سنائی دی۔ میرا دل دھڑکنا شروع ہو گیا۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔ اور میں کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

میرا دل غم کی گہری وادیوں میں ڈوب گیا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں کیوں ہنسی۔

میں آدھی سیڑھیاں طے کر کے سانس روک کر کھڑی ہو گئی۔ اور سننے لگی۔ کہ دادا جان کیا کہہ رہے ہیں۔ دادا جان کہہ رہے تھے۔ میں کہتا ہوں۔ جب وہ اچھا بھلا کماؤ مرد ہے۔ اپنی دو کان کرتا ہے۔ چار پیسے روز کما کر لے آتا ہے۔ کیا ہوا جو اُسے بھنگ اور افیون کا نشہ پینے کی عادت ہے۔ تُو زاہدہ کی بات وہاں پکی کیوں نہیں کرتی! ـــــ میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں کب تک انتظار کروں! تُو بیٹی کو اسکول بھیج کر ہماری عزت داغدار کر رہی ہے حرامزادی کی بچی! دیکھ میں آج تجھے کیسے ٹھیک نہیں کرتا ابھی گھر سے نکال باہر کر دوں گا۔

آج زاہدہ کو آ لینے دو۔ جو اِس گھر سے اُس نے پھر باہر قدم رکھا۔

یار سے ملنے جاتی ہے۔ اسکول کیا جاتی ہو گی بھلا کبھی شریفوں
کی بہو بیٹیاں بھی گھر سے نکلی ہیں۔ ہم نے کونسی نوکری کرانی ہے !!

اور امی کہہ رہی تھیں :۔

تُو نے جو ظلم مجھ پر کئے ہیں۔ میں نے صبر کے ساتھ سارے
برداشت کئے۔ میں نے اُف تک نہیں کی۔ یونہی ساری جوانی تیرے
ظلموں تلے کاٹ دی۔ مگر اب بیٹی کے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دونگی۔
میں اُس نامراد افیونی کے ساتھ اپنی چاند سی بیٹی کبھی بیاہنے نہ دونگی
جا، آج میں بھی تجھے صاف کہے دیتی ہوں۔ آج تیرا لحاظ بھی ختم ہو گیا
ہے اب تو میری بیٹی کے ساتھ ظلم نہیں کر سکتا۔

دادا جان نے یہ سنتے ہی چولھے سے آدھ جلی لکڑی نکالی اور
مارنے ہی لگے تھے کہ میں اوپر چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ لکڑی والدہ
کو مارنے کی بجائے میری طرف لے کر آئے۔ اور زور سے میری پیٹھ
پر ماردی۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ مگر مجھ سے کھڑا نہ ہوا جا سکا میں
گر پڑی ۔ ہمسائیوں کی باتیں ۔ امی کے رونے کی آوازیں۔ یہ سبھی کچھ
دور کنوئیں سے آتا محسوس ہوا۔ رات گئے تک غنودگی سی طاری رہی

اور پھر ہوش میں آگئی۔ میں روتی رہی۔

یا خدا تُو نے مجھے کس گھر میں پیدا کر دیا ہے! اگر اِس گھر میں پیدا کرنا تھا۔ تو پھر ایسا دل کیوں دیا! دل کے اندر ایسی آرزوئیں کیوں پیدا کر دیں؟ علم سے اتنی محبت کیوں دیدی؟ یہ کتنا ظالم دادا ہے بوڑھا ہو گیا ہے۔ مگر مرتا بھی نہیں۔ کتنے عرصے سے ظلم کر رہا ہے! اوروں کے گھر میں یہ ظلم کیوں نہیں ہوتا۔ ہمارے گھر میں کیوں ہوتا ہے؟ ہم نے کونسا گناہ کیا ہے؟ ہم کو کیوں سزا مِل رہی ہے؟ یہ ظلم کیوں ہو؟ اسے نہیں ہونا چاہیئے۔ میں ظلم کرنے والے کو خود مٹا دوں گی۔ ہمیں بھی دنیا میں خوش رہنے کا حق حاصل ہے۔ میں کل ہی امی سے کہوں گی۔ ہم اِس گھر کو چھوڑ کر کہیں اور چل دیتے ہیں۔ جہاں یہ دادا نہ ہو۔ اور لڑکیاں کتنی خوش رہتی ہیں۔ اُن کے والدین اُن کو پڑھنے سے کبھی منع نہیں کرتے۔

کل میں آسیہ کے گھر اُس کی کتاب پڑھنے کے لئے لینے گئی تھی۔ اُن کا گھر کتنا بڑا ہے؟ کتنا خوبصورت سجا ہوا ہے! کاش! ہمارا بھی ایسا گھر ہوتا! اس کی امی نے کتنے اچھے کپڑے

پہنے ہوئے تھے۔ نوکر کام کر رہے تھے۔ اور پھر نچلے کمرہ میں جب
میں آسیہ کا کمرہ سمجھ کر اندر چلی گئی تھی۔ اور صوفے پر ڈرتے ڈرتے بیٹھ
گئی تھی۔ اور پھر میں کتاب کی تصویریں دیکھنے میں اس قدر محو ہو گئی۔ کہ
مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ کب اُس کا بھائی آن کر سامنے بیٹھا سگرٹ پی رہا
ہے۔ اور مجھے گہری نظروں سے تک رہا ہے۔ اور جب مَیں نے
اُس کو دیکھا۔ تو چیخ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اور میں گھبرا گئی
اور میرا حلق خشک ہو گیا۔ اور مَیں اُٹھ کر بھاگنے لگی تھی۔ کہ اُس نے
ہاتھ سے پکڑ کر بٹھا لیا۔

آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئیں۔ واقعی یہ میری زیادتی تھی۔ آپ
مت جائیں۔ میں خود چلا جاتا ہوں۔ صرف اِس سگرٹ کو ختم کرنے
تک یہاں بیٹھوں گا۔ آپ شوق سے تصویریں دیکھیں۔ اور اگر آپ
کو تصویروں کا شوق ہے۔ تو مَیں اور لا دیتا ہوں۔ اِدھر الماری
میں بہت سی پڑی ہیں۔

آپ خود ہی اُٹھ کر نکال لیں۔ یہ آپ کے پچھلی طرف جو الماری
ہے نا۔ نکال لیں وہاں سے۔

ارے! آپ تو خواہ مخواہ اتنا زیادہ شرما رہی ہیں۔ اِس میں بھلا شرمانے کی کیا بات ہے! اور پھر آپ کا ہاتھ بھی کس قدر ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

اچھا آپ تو بول ہی نہیں رہیں۔ مَیں خود ہی نکال دیتا ہوں۔ یہ دیکھئے —— یہ سوئٹزرلینڈ کی تصویر ہے ——

اور یہ

کیا آپ کو پسند ہیں! آپ لینا چاہیں تو لے سکتی ہیں۔ آسیہ نے بتایا تھا۔ آپ کو ایسی تصویروں کا بہت شوق ہے۔ اور خوش قسمتی کہیئے یا بدقسمتی سمجھئے۔ مجھے بھی بہت شوق ہے۔ لیکن آسیہ کو ذرا سا بھی لگاؤ نہیں ہے۔

لیکن آپ کتنی چپ بیٹھی ہیں۔ کوئی تو بات کریں۔ میں اُس وقت سے خود ہی بول رہا ہوں۔

لیکن میں تو گونگی ہو گئی تھی ——— ایک لفظ تک نہیں بولا جا رہا تھا۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد آسیہ آگئی۔ اور ساتھ نوکر چائے لے کر آیا۔ اور اُس کا بھائی بھی زبردستی چائے میں شریک ہو گیا۔

کتنی باتیں کرتا تھا اُس کا بھائی! کتنا ہنس مُکھ اور کتنا خوبصورت سا ہے۔ اُس کی آنکھیں کس قدر چمکدار تھیں۔ اور جسم کتنا اچھا تھا۔ لیکن وہ اتنی دلچسپی سے کیوں باتیں کر رہا تھا ——— اور پھر دوبارہ آنے کا کتنا اصرار کر رہا تھا۔ آج آسیہ نے بھی کہا تھا۔ کہ تمہارے جانے کے بعد میرے بھائی نے تمہاری بہت تعریف کی تھی۔ کہتا تھا بڑی بھولی اور معصوم اور پیاری سی لڑکی ہے۔ اور میں خواہ مخواہ شرما گئی تھی۔

ہائے! اگر دادا جان کو پتہ چل جائے۔ کہ میں نے ایک مرد کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی ہے۔ تو وہ ابھی مع والدہ اور بہن بھائی کے ہمیں کند چھری سے ذبح کر دے۔ اور خود پاگل ہو جائے۔ اس کے خیال میں دُنیا میں قیامت آ جائے۔ کیونکہ دادا جان قیامت کی

نشانیاں یہی بتاتے ہیں۔ اور دوزخی ہونے کی یہی جب کوئی لڑکی کسی غیر لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے گی۔ چاہے وہ باتیں قرآن مجید اور نماز کی کیوں نہ ہوں؟ تب قیامت آجائے گی۔

لیکن قیامت تو کوئی نہیں آئی۔ نہ آئے گی۔ دادا جان کا تو دماغ خراب ہے۔ ہائے پیٹھ پر کتنا درد ہو رہا ہے۔ امی سینک کرتی رہی تھیں۔ دو تین روز تک اسکول نہ جا سکوں گی۔ اچھا گھر میں بیٹھ کر کام کروں گی۔

دیکھیں! دادا جان کیا قیامت کھڑی کرتے ہیں ______

اب تو امی بھی کہتی ہیں۔ کہ اسکول جانا چھوڑ دے۔ کیا فائدہ! یہ تجھے بدنام کر دے گا۔

ہائے امی! یوں نہ کہو ___ میں پڑھنا کبھی نہ چھوڑوں گی۔ خدا کے لئے اپنی بیٹی کا دل نہ توڑو۔ یہ دادا تو پاگل ہے۔

۲۹ر نومبر:۔

آج کئی روز کے بعد اسکول گئی۔ اداس اور غمگین ہو کر۔ دل پریشان سا رہتا ہے۔ دادا جان جانے نہیں دیتے تھے۔ بڑی مشکل سے ان کی خوشامدیں اور منّتیں کر کے گئی تھی۔ کہ اس جماعت کو پاس کر لوں۔ یہ آخری جماعت ہے۔ پھر دسویں پاس کر لوں گی۔ پھر آگے نہیں بیٹھوں گی ــــ تب کہیں جا کر وہ مانے۔ آسیہ اسکول نہیں آئی تھی۔ مَیں نے کتاب واپس کرنی تھی۔ چھٹی کے بعد اُس کے گھر گئی تو پتہ چلا۔ کہ وہ (SHOPING) شاپنگ کے لئے بازار

گئی ہوئی ہے۔ بس اب آنے ہی والی ہوگی۔ مجھے بیٹھ کر اس کا انتظار کرلینا چاہئے۔ نوکر نے نچلے کمرہ کا دروازہ کھول دیا۔ اور میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر گزری۔ تو مجھے اچانک خیال آیا۔ کہ اگر اس کا بھائی آگیا تو" اور میرا دل دھڑکنا شروع ہو گیا۔ میں نے سوچا۔ کل اسکول میں کتاب واپس کر دوں گی۔ مجھے چلے ہی جانا چاہئے۔ اور میں اُٹھ کر آنے لگی۔ سیڑھیاں طے کر رہی تھی۔ کہ آسیہ معہ اپنے بھائی کے بازار سے واپس آگئی۔

ہلو! زاہدہ! تم کب آئیں؟

ابھی ابھی آئی تھی ——— بس اب جانے لگی تھی۔ میں نے رُک رُک کر کہا:

تو تم کچھ دیر بھی انتظار نہ کر سکیں۔ بس یہی ہماری قدر ہے! آسیہ نے منہ بنا کر کہا۔

نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ میں نے سوچا تھا۔ کہ کہیں زیادہ دیر نہ ہو جائے۔ کل آجاؤں گی ———

اس کے بعد ہم تینوں اندر کمرہ میں جا بیٹھے۔ اور پھر جو باتیں

شروع ہوئیں تو گھنٹہ ہوگیا۔ سردیوں کے دن بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔
کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تو شام پھیل رہی تھی۔ میرا دل بڑا ڈرا۔ کہ دادا جان
تو جان ہی نکال دیں گے۔

میں بڑی مشکل سے آسیہ سے رخصت لے کر آئی۔ اور تیز
تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف چلنے لگی۔ دادا جان گھر پر نہیں تھے میں
نے خدا کا شکر ادا کیا۔

رات کو مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ آسیہ کا بھائی یاد آتا رہا
اُس کو سُرخ ٹائی کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ اور فاختائی رنگ، گرم
سوٹ اُسے کتنا سج رہا تھا ــــ اُس کے چہرے پر کس قدر دلکشی
ہے!

اور یہی سوچتی ہوئی سو گئی۔

۵ ار دسمبر:-

امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ نوماہی امتحان ہورہے ہیں۔ آسیہ نے کئی بار بلایا ہے۔ مگر میں جا ہی نہیں سکی۔ کل تو آسیہ خفا ہی ہوگئی۔ کہ تم کیوں نہیں آئیں۔ نجمہ کوئی دو مہینے سے اسکول نہیں آرہی۔ نجمہ میری بہت پیاری دوست ہے۔ کتنی مہربان اور مخلص لڑکی ہے۔ دسویں کلاس کے بعد مجھ سے جدا ہوجائے گی۔ اس کے ابّا جان کی تبدیلی کولمبو ہوگئی ہے۔ یہ وہاں چلی جائے گی۔ پھر نہ جانے کب آئے گی۔

آسیہ اور قسم کی لڑکی ہے۔ اِس سے میری طبیعت نہیں ملتی۔ مگر نجمہ تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے۔ کہ وہ مجھے برابر خط لکھے گی۔ ننھے انجم کو بھی نجمہ کس قدر پیار کرتی ہے!—— میرا ننھّا بھیّا انجم اداس ہو جائے گا۔ اور نسیمہ بھی——

کاش! میں بھی نجمہ کے ساتھ کولمبو جا سکتی۔ سیلون کس قدر خوبصورت شہر نہ ہوگا؟ وہاں ناریل کے درخت ہیں۔ تیز بارشیں ہیں۔ کنول کے پھول ہیں۔ جھیلیں ہیں۔ مندر ہیں —— آسیہ کے بھائی نے بتایا تھا کہ سیلون میں سڑک پر گندگی کے ڈھیر کی جگہ بھی پھولوں کے ڈھیر ہوتے ہیں —— ہائے! وہ شہر کس قدر خوبصورت ہوگا!

۲۶ نومبر:-

آسیہ دسمبر کی چھٹیوں میں کراچی سیر کے لئے گئی ہوئی ہے
مجھے اس نے بتایا ہی نہیں۔ میں اس کے ہاں گئی۔ تو پتہ چلا کہ سارے
چلے گئے ہیں۔ اس کا بھائی گھر پر موجود تھا۔ میں نے واپس آنا چاہا
تو اُس نے ٹھیرا لیا —— میں گھبرا گئی۔ میں، ٹھیرنا نہیں چاہتی تھی
اکیلے گھر میں۔ اگرچہ نوکر بھی تھے۔ مگر پھر بھی مجھے ڈر تھا کہ آسیہ کیا
کہے گی۔

لیکن اُس نے زبردستی بٹھا لیا۔ نوکر کو چائے لانے کو کہہ دیا

میں بہتیرا منع کرتی رہی۔ مگر وہ نہ مانا ـــــــ پھر اُس نے مجھے کشمیر کی تصویریں دکھائیں۔ کشمیر اور کلّو کی چراگاہیں۔ وہاں کے نظارے ـــ اور بتایا۔ کہ یہ ساری تصویریں میں نے خود کیمرے سے لے کر رنگ بھرے ہیں ـــ اور میں نے کشمیر کا کونہ کونہ دیکھا ہوا ہے۔ وہاں اتنے خوبصورت پہاڑ ہیں۔ پھول ہیں۔ درخت ہیں۔ چوٹیاں ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں ہیں۔ کہ تم دیکھو، تو پاگل ہو جاؤ۔

مجھے سیر و سیاحت کا بہت شوق ہے۔ اور میں ساری دنیا کا چکر لگانا چاہتا ہوں۔ پچھلے سال میں انگلینڈ چھ ماہ رہ کر آیا ہوں۔

تمہیں وہاں کی باتیں کیا بتاؤں! ـــ کس قدر آزاد اور خوشحال اور خوبصورت ملک ہیں۔ ہم لوگ تو ان کے مقابلے میں صفر کے برابر بھی نہیں ہیں۔ وہاں عورتیں آزاد پھرتی ہیں۔ اُن کی صحتیں اس قدر اچھی ہیں کہ گلاب کے پھول معلوم ہوتی ہیں ـــ مگر ـــــــ اور پھر جھجک کر وہ کہنے لگا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے تم سے زیادہ بھولی اور شرمیلی نہیں ہیں۔

اچھا دیکھو زاہدہ! ایک بات کہوں۔ بُرا تو نہ مانوگی۔ لیکن اگر تم بُرا

بھی مناؤ گی۔ تو بھی میں کیسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تم کو بہت پیار کرنے لگا ہوں۔ اور زاہدہ! تم مجھے بہت یاد آنے لگی ہو۔ جس دن سے تمہیں دیکھا ہے۔ بہت اُداس رہنے لگا ہوں ——

کیا تم اس گھر میں رہنا پسند کرو گی! ——

کیا تم آسیہ کی بھابی بنو گی!! ——

کیا تم میری بیوی بنو گی!!! ——

میں ایسی محبت نہیں چاہتا۔ جو صرف محبت ہو۔ بلکہ میں تو تم سے شادی کر کے اپنی بیوی بنا کر گھر لانا چاہتا ہوں۔ اور ساری عمر اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔

بولو! کیا تم میری بنو گی! ——

ہائے! میں اُس کی باتوں کا بھلا کیا جواب دیتی۔ میں شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ مجھ سے تو آنکھ تک نہیں اُٹھائی جاتی تھی۔ بولنا تو الگ رہا۔

آسیہ کا خوبصورت۔ نوجوان اور دلکش چہرے والا بھائی۔ اختر میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اور مجھے تکے جا رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل

سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو وہ پُرفسوں نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ میں سر سے لے کر پاؤں تک لرز گئی ——— میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گیا —

وہ بولا ——— بتاؤ نا زاہدہ! کچھ تو بولو۔ کیا تم مجھے پسند نہیں کرتیں!

لیکن میں خاموش رہی۔ میں اُسے کیا بتاتی! میں اُسے کیا جواب دیتی! ———

بھلا دھرتی کے باسی پھول اور آسمان کے چمکتے ہوئے ستارے کا بھی کبھی ساتھ ہوا ہے! بھلا مخمل اور ململ کا بھی کبھی میل ہوا ہے!! کہاں محلوں میں رہنے والا اختر ——— اور کہاں جھونپڑی میں رہنے والی زاہدہ! کشادہ باغوں اور تنگ گلیوں کا کیا میل! میرا دل ایکدم اداس ہو گیا ——— میرا دل ایک دم اُس کی محبت سے بھر آیا! اپنی غریبی پر بھر آیا۔ اس آغاز کے انجام پر رونے لگا ——— اور آخر میں دادا جان کا چہرہ یاد آتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور یہ رونا اس وقت اور تیز ہو گیا۔ جب مجھے کریم افیونی اور بھنگی کا خیال

آیا۔ جس کے ساتھ میرا دادا مجھے باندھنا چاہتا تھا۔ اختر میرے رونے پر حیران رہ گیا۔ اُس نے سمجھا۔ کہ شاید اُس کی باتیں مجھے بُری لگی ہیں۔ بچارا گھبرا گیا۔ کہنے لگا۔

زاہدہ! خدا کے لئے مت روؤ! مجھے بتاؤ۔ رونے کی وجہ کیا ہے؟ کیا میری کسی بات پر تمہیں رونا آیا ہے! میری باتیں تمہیں بُری لگی ہیں! ——— کیا تم اِس رشتہ کو پسند نہیں کرتیں!! اگر تم نہ چاہو تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔ مگر خدا کے لئے روؤ نہیں۔ دیکھو ابھی نوکر چائے لے کر آجائے گا۔ تو وہ دیکھے گا تو کیا کہے گا ——— چپ ہو جاؤ ——— یہ کہہ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اُسے چوم لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ میں کیا کروں۔ میں نے جلدی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اور پھر بغیر بات کئے۔ چائے پئے گھر آگئی۔ اُس نے کتنا زیادہ اصرار کیا۔ مگر میں نہ ٹھیری۔

ہائے! میں کتنی پاگل ہو گئی تھی ——— میں نے اُس کی بات کا کوئی جواب ہی نہ دیا! کیا پتہ میری قسمت کتنی اچھی ہی ہو۔ اگر میری شادی وہاں ہو جائے تو! ——— سب ہمسائیوں کی آنکھیں کھُلی

کی کھلی رہ جائیں۔ میری سہیلیاں حیران رہ جائیں۔ میری والدہ کے
چہرے پر پھیلی ہوئی کتنی ہی جھریاں ٹھیک ہو جائیں۔ ہائے اللہ ابھار
کتنے دن نہ پھر جائیں! میرا چھوٹا بھائی اور بہن ایسا بھائی پا کر
کس قدر خوش نہ ہوں! لیکن ہمارا گھر تو کس قدر چھوٹا سا ہے۔ کیا
وہ یہاں آجایا کرے گا! کیا اس کے گھر والے مان جائیں گے!
نہیں وہ نہیں مانیں گے۔ وہ کیسے مانیں گے۔ کہ ان کا اکلوتا
بیٹا اور بھائی ایک غریب لڑکی سے شادی کرلے! —— کبھی
نہیں مانیں گے۔

میں بھی بھلا کتنی پاگل ہوں۔ جو ایک دم سوچنے پر اُتر آئی ہوں
کیا معلوم اس نے مذاق ہی کیا ہو ——

میں تو سچ مچ پگلی ہوں!

اب میں ایسا کبھی نہ سوچوں گی۔ میں اس کے گھر ہی نہیں جاؤنگی۔
کبھی نہیں جاؤں گی۔ کہیں دادا جان کو پتہ چل گیا تو وہ گلا ہی دبا
دیں گے۔

یا خدا! میری مدد کرنا۔ مجھے وہاں جانے سے روکنا۔ آمین

ثم آمین ۔ اے میری نیند! تو اب جلدی سے میرے پاس آجا ئیں
اب سونے جا رہی ہوں ۔ امّی کہہ رہی ہیں ۔ کہ اتنی رات گئے تک
مٹّی کے دئے تلے بیٹھ کر اسکول کا کام مت کر آنکھیں خراب
ہو جائیں ۔ اُن کو کیا پتہ ۔ کہ آنکھوں کے ساتھ یہاں دل بھی خراب
ہو رہا ہے ۔

یا خدا! میری مدد کرنا ۔ مجھے بُری راہ سے بچانا ۔ میری سہیلیاں
کہتی ہیں ۔ کہ مرد بے وفا ہوتے ہیں ۔ لڑکی کو خراب کر کے چھوڑ جاتے
ہیں ۔ بدنام کر دیتے ہیں ۔ یا خدا! مجھے ان سے بچانا ۔ ضرور بچانا ۔
آمین ؎

۲ر جنوری :-

آج سے اسکول کھُل گیا ہے۔ صبح سویرے اسکول گئی۔
دعا ہوئی۔ دعا کے بعد کلاس میں آگئی۔ آسیہ ملی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا
رہی تھی۔ میرا دل ایک دم دھڑکنے لگا۔ میں نے آنکھیں نیچی کر لیں
جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہوں۔ وہ ہنسنے لگی۔ اور پھر مجھے ایک
طرف لے جا کر ایک رقعہ دیا۔ کہ یہ لو، اِسے آدھی چھٹی کے وقت پڑھ
لینا۔ ابھی ڈسک میں بند کر کے رکھ لو۔ میں نے بغیر جواب دئے جلدی
سے لے لیا۔ اور ڈسک میں بند کر لیا۔ کہیں لڑکیاں نہ دیکھ لیں ——

مجھے یوں محسوس ہوا ۔ جیسے میں پہلے ہی اس چیز کی منتظر تھی آدھی چھٹی کے وقت پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی ۔ لیکن سارا وقت بے چین سی رہی ۔ بار بار تالے کو دیکھتی رہی ۔ کبھی سوچتی، نہ جانے کیا لکھا ہے ! کیا لکھا ہوگا ؟ پتہ نہیں کیا ہوگا ؟ کہاں جا کر دیکھوں ؟ —— اچھا —— LATRINE میں جا کر دیکھتی ہوں ۔ اور پھر میں اُدھر چلی آئی ۔ اور LATRINE میں جا کر خط کھولا ۔ اور پڑھا لکھا تھا

پہلی دفعہ کچھ سمجھ نہ آئی ۔ دوسری بار پھر پڑھا :-

" پیاری زاہدہ !

تمہیں بہت بہت پیار !

تم اُس دن سے برابر یاد آ رہی ہو ۔ میں روزانہ گھر پر تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں ۔ مگر تم نہیں آئیں اگر تمہیں میری اُس دن کی باتوں کا بُرا لگا ہو ۔ تو مجھے معاف کر دو ۔ لیکن میں کیا کروں ! میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں ۔ اور اب بھی تمہیں وہی باتیں دہرا کر تم سے جواب مانگتا ہوں ۔ امید ہے تم ضرور جواب دو گی ——

کیا تم آج اسکول کے بعد آؤ گی !

میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔ فقط

صرف تمہارا

اختر"

خط پڑھ کر میں نے جلدی سے پھاڑ دیا۔ اور ٹکڑے وہیں پھینک کر آ گئی۔ باہر نکلی تو یوں لگا۔ اندر داخل ہوتے وقت جو مال گاڑی سر پر کھڑی تھی۔ وہ اب گزر چکی ہے۔ اور میں ہلکی ہو کر نیچے آ گئی ہوں۔

میں خاموشی سے سیڑھیاں طے کر کے نیچے آ گئی۔ مجھے یکدم یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے اختر اور آسیہ مل کر مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ بھلا اختر کو مجھ سے ایسی کونسی محبت ہو سکتی ہے!—— لیکن میں بے وقوف نہیں بنوں گی —— میں کبھی نہیں جاؤں گی ساری چھٹی کے وقت آسیہ نے مجھ سے پوچھا۔ زاہدہ! آج ہمارے گھر آؤ گی!

نہیں میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ میں نہ آسکوں گی —!

اور وہ چلی گئی۔ میں اپنے گھر آئی۔ اور اداس اور خاموش سی ہو کر اپنی کھڑکی میں بیٹھ گئی۔ سامنے کے مکان میں ایک لڑکا اظہر رہتا ہے۔ اُس کی نئی شادی ہوئی ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اُدھر دھوپ میں چارپائی پر بیٹھا ہؤا ہے۔ اور بیوی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی ہے۔ اور وہ محبت اور پیار سے بھری ہوئی نظروں سے اُسے تک رہا ہے —— اور وہ مسکرا رہی ہے۔

مجھے ایک دم یُوں لگا۔ جیسے اظہر کی جگہ اختر ہے۔ اور اُس کی بیوی کی جگہ میں ہوں۔ اور دنیا بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ جہاں قدم قدم پر ایسا پیار کرنے والے خاوند کی مسکراہٹ اور پُر محبت نظریں میّسر ہیں۔ مگر دادا جان کی آواز نے میری تصویر کو دھندلا کر دیا۔ اور میں اُن کے پاس جا پہنچی۔

کیا بات ہے دادا جان!

بیٹی! ذرا میرے حقے میں دو کوئلے تو چُولھے سے لا ڈال! اور دیکھ! دھر طاق پہ تمباکو کی پُڑیا پڑی ہے۔ اُسے بھی لیتی آ، اور دیکھ! نسیمہ اور انجم باہر گلی میں نکلے تھے۔ آدھ گھنٹہ ہو گیا ہے۔

ابھی تک واپس نہیں آئے ۔ ان کو ذرا آواز دے ۔

میں نے خاموشی سے سارے کام کر دیئے ۔ اور پھر کھڑکی کے پاس آبیٹھی ۔ مگر اب وہ دونوں نیچے چلے گئے تھے اور مجھے یوں لگا ۔ جیسے وہ نیچے نہیں گئے ۔ بلکہ آسیہ کے گھر گئے ہیں ۔

۲۶ر جنوری :-

کئی روز سے اُداس اور خاموش ہوں - آسیہ سے کتراتی ہوں - حالانکہ اُس نے گھر آنے کے لئے کئی بار کہا ہے - مگر میں نہیں جاؤں گی - میں کیوں جاؤں !! ——— میری زندگی ایک ایسا اداس گیت ہے - جیسے امتحانوں میں ایک ماہ رہ گیا ہے - اب مجھے پُورے دھیان سے پڑھنا چاہیئے - پہلی مارچ کو امتحان شروع ہو رہے ہیں -

خدا کرے ۔ میں میٹرک میں وظیفہ لے لوں ۔ اِس کے بعد
میں ایف ۔ اے کروں گی ۔ پھر بی ۔ اے ۔ اور پھر ایم ۔ اے ۔
اور پھر انگلینڈ چلی جاؤں گی ——
ہائے ! کتنا اچھا ہو ۔ جو ایسا ہو جائے !
کاش ایسا ہو جائے ! آمین ۔

---

۴ ر فروری :-

آج آسیہ نے بتایا۔ کہ اُس نے ایسے گیس پیپر منگائے ہیں۔ جن میں سے پُورے کے پُورے سوال آجائیں گے۔ اور وہ کہنے لگی۔ کہ وہ مجھے بھی ضرور دے گی۔

آسیہ کتنی اچھی لڑکی ہے۔ اُس نے کلاس میں کسی اور لڑکی کو نہیں بتایا۔ صرف مجھے بتایا ہے۔ میں خواہ مخواہ اُس سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔

اُس کے بھائی نے بڑی مشکل سے۔ یونیورسٹی کے کسی شخص سے
حاصل کئے ہیں۔ اور اب وہ مجھے ضرور دے گی۔ وہ اسکول نہیں
لا سکتی نا۔ کیونکہ اگر یہ بات OUT ہو گئی۔ تو پھر اُس شخص کے لئے
بڑی مشکل ہو جائے گی۔ اور پھر پرچے نئے سرے سے بنوانے
پڑیں گے۔

میں کل لینے کے لئے اُس کے گھر جاؤں گی۔ آج میرے
کپڑے کچھ اچھے نہیں ہیں۔ کل جاؤں گی ——

---

۵ رفروری :-

آج میں آسیہ کے ہاں گئی۔ اُس کا بھائی کمبل اوڑھے
پلنگ پر سویا ہوا تھا۔ ہم دوسرے کمرہ میں چلی گئیں۔ آسیہ کہنے
لگی۔ پرچے بھیا کی الماری میں ہیں۔ ابھی اُٹھیں گے تو دیں گے
اس کے بعد ہم اور باتیں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد
اختر اُٹھا۔ آنکھیں نیند سے بھاری ہو رہی تھیں۔ چہرے پر عجب
طرح کا سحر تھا۔ مجھے دیکھا۔ تو بے حد خوش ہوا۔ اور جلدی سے
میرا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ اور پھر زور سے ہاتھ دبا لیا۔ میں شرم سے

پاگل سی ہوگئی۔

کتنا پاگل ہے اس کا بھائی۔ آسیہ کے سامنے ایسی حرکت کردی۔ اور پھر ایسی حرکت کی کیوں؟ —— مجھے برا سا لگا۔ مجھے ڈر سا لگا۔ میں پریشان سی ہوگئی۔ میرا دل گھبرانے لگا۔

اور میں ہاتھ چھڑا کر دیوار کے ساتھ لگ کر خاموش کھڑی ہوگئی۔ میرے سر کے اوپر کلاک ٹِک ٹِک کر رہا تھا۔ اور کھڑکی سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ اور آسیہ بے خبر بنی الماری میں سے پرچے ڈھونڈھ رہی تھی۔ اختر نے کہا۔

پرچے تو اُدھر والے کمرہ میں پلنگ کے ساتھ والی میز پر پڑے ہیں۔ اور وہ لینے کو اُدھر چلی گئی۔

اختر نے مجھے پکڑ کر پلنگ پر بٹھا لینا چاہا۔ مگر میں نے سختی سے کہا۔ آپ نے جو بات کرنی ہو۔ منہ سے کریں۔ مجھے ہاتھ مت لگائیں۔ کیوں، کیا میرے ہاتھ ایسے ہی گندے اور بُرے ہیں!! اگر یہ بُرے ہیں۔ تو لو۔ میں انہیں کاٹ لیتا ہوں۔ خون نکال لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ دانتوں تلے زور سے دبا لیا۔ اور پھر مجھے دکھایا۔ دانت

اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ پھر کہنے لگا:

اچھی زاہدہ! دیکھو! یہاں کرسی پر آن کر بیٹھ جاؤ۔ یہاں کھڑا ہونا کس قدر برا لگ رہا ہے۔ تم بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جانے میں بھلا کیا ہرج ہے! تم نے آج تک کبھی میری بات نہیں مانی۔ لو بیٹھو یہاں۔ اور میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ اور مجھے تکنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں وہی سحر اور التجا تیرنے لگی۔

اُس نے پھر وہی کہا۔ زاہدہ! کیا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟

میں نے اُداس آواز میں کہا:

"نہیں"

کیوں!

یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ آپ خواہ مخواہ میرا مذاق نہ بنائیں۔

خدا کی قسم۔ میں تمہارا مذاق نہیں بنا رہا۔ تم یقین کرو۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ اور میں واقعی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

پھر آپ اگر میرے ساتھ مذاق نہیں کر رہے۔ تو اپنے ساتھ

کر رہے ہیں۔

میں اپنے ساتھ مذاق نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ اپنے ساتھ خوشی کی بات کر رہا ہوں۔

زاہدہ! مجھے تمہاری قسم۔ جو میں جھوٹ بولوں۔ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

کیوں نہیں ہو سکتا زاہدہ!

ہم غریب لوگ اور آپ امیر لوگ۔ ہمارا اور آپ کا کیا رشتہ!

تم امیری غریبی کی بات نہ کرو۔ میں ایسی ہر بات سے آزاد ہوں میں جس سے شادی کرنا چاہوں۔ اس سے شادی کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔

تمہارے گھر والے کبھی نہ مانیں گے۔

اگر وہ میری بات نہ مانیں گے۔ تو اور کس کی مانیں گے۔

وہ اپنے وقار اور عزت کی بات مانیں گے۔

میرا نام ہی اُن کا وقار اور عزت ہے۔ زاہدہ! تمہیں اس سے

کیا! تم ایک دفعہ ہاں کردو۔ اپنے دل کی بات بتا دو۔ پھر میں جانوں اور میرا کام۔ تمہیں اس سے کیا؟

اور میں خاموش ہو گئی۔ میں اور کیا کہتی! بھلا جیسے اختر جیسا اچھا اور چاہنے والا خاوند مل جائے۔ اُسے کیا چاہیئے!

میری خاموشی پر وہ کہنے لگا:

تو کیا میں تمہاری خاموشی کو ہاں سمجھ لوں۔

اور میں نے سر جھکا دیا۔

بس جی! اُس کی تو باچھیں کھل گئیں۔ اور اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وعدہ کیا۔ کہ وہ زندگی بھر میرا ساتھ دے گا۔ ہر حال میں ساتھ دے گا۔ سارے گھر والوں کو، خاندان کو چھوڑ دیگا مگر مجھے نہ چھوڑے گا۔ اور یہ کہہ کر اُس نے میرے ہاتھ کو کئی بار چوما۔ اور پھر میں آسیہ سے ملے بغیر گھر آ گئی

میرا دل خوشی کے مارے اچھل رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا گھر میں داخل ہوتے ہی بھاگ کر والدہ کے سینے سے چمٹ جاؤں۔ اور اُسے بتاؤں۔ سارا کچھ بتا دوں۔ سیڑھیاں طے کرتے ہی ننھی نسیمہ ملی

میں نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ اور بہت پیار کیا۔ میں بے حد خوش تھی۔ میرا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔ مَیں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا تو سُرخ ہو رہا تھا۔

آج والدہ کہہ رہی تھیں۔ کہ تُو اتنی خوش کیوں ہے؟ آج میں والدہ کو بہت دیر تک دباتی رہی۔ اُن کے مطلب کی باتیں کیں۔ اُن کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ اور جو جو کام وہ کہتے رہے۔ وہی کرتی رہی۔

---

۶ فروری :-

ساری رات میں بالکل نہیں سو سکی ۔ ساری رات میرے خوابوں میں اختر چھایا رہا ۔ کبھی ہم دونوں نیلگوں پہاڑیوں کو عبور کر رہے ہیں ۔ کبھی ہم وادیوں اور گھاٹیوں کو طے کر رہے ہیں ۔ ہم دونوں نے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں ۔ اور گھوم رہے ہیں ۔ میں نے بیحد خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے ہیں ۔ اور اختر مجھے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے ۔

رات بار بار نیند ٹوٹ جاتی تھی ۔ آج کی صبح بڑے ہی عجیب

انداز سے طلوع ہؤا۔

آج سورج نے بڑی شان سے آنکھیں کھولیں۔ آج کی صبح کس قدر خوبصورت تھی۔ !

آسمان پہ بادلوں کے خوبصورت جزیرے بنے ہوئے تھے۔ نیلا آسمان، اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ میری آنکھیں۔ اپنے آپ بند ہونے لگیں۔

امّی نے آن کر اٹھایا۔ بیٹی! کیا آج نماز نہ پڑھوگی! جلدی اُٹھو۔ اسکول سے دیر ہو جائے گی۔

لیکن امّی! دیکھو تو آسمان پر کتنے خوبصورت بادل چھل رہے ہیں۔ ہوا کتنی پیاری چل رہی ہے۔ امی! آج تو سونے کا دن ہے۔

پاگل بیٹی! بس بادلوں اور ہوا اور پھولوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہے۔

چل اُٹھ! اب بستره کو چھوڑ دے۔ چل میری بیٹی! اور میں اُٹھ بیٹھی!

اور جلدی سے تیار ہو کر اسکول چل دی ۔ وہاں پر آسیہ ملی ۔ اور اُس نے مجھے گلے لگا لیا ۔ نہ جانے کیوں ! کیا اُسے علم ہو گیا ہے ! میرا دل دھڑکا ۔ اور اُس نے ہولے سے میرے کان میں " بھابی " کہا ۔ اور میں سُرخ شفق بن گئی ۔

تو تم بھی مجھے بنانے لگ پڑی ہو !

میں بھلا کیوں بنانے لگی ! اور پھر میں نے کیا بھی کیا ہے ؟

نہیں تو خواہ مخواہ شک ہو گیا ہے ۔

کاہے کا شک ؟

اچھا بتاؤ ۔ پرچے لائی ہو ؟

اونہوں !

تو پھر کیسے دو گی ؟

گھر آن کر لے جانا ــــ

میں نہیں روز روز گھر آتی ۔

اب تو روز روز آنا پڑے گا ۔

امّی کو آن کر پھر تم ہی منانا ۔

ہاں میں اُن کو کہہ دوں گی ۔

اور دادا جان کو !

اُن کو خدا بتا دے گا !

خدا کیا اسکول میں پڑھتا ہے ؟ اور کب آکر کہے گا ؟

آج سے دو سال کے بعد خدا آن کر کہے گا۔ تب تیرا دادا خود تجھے دلہن بنا کر ہمارے گھر رخصت کرے گا۔ سمجھیں !

اور دعا کے لئے بل BELL ہوئی - اور دعا کے وقت مَیں نے سر جھکا کر خدا سے عاجزی سے دعا مانگی ۔ کہ یا خدا میری مدد کرنا ۔ مجھے بدنامی سے بچانا ۔ اور میرا ساتھ دینا ۔

اور دعا مانگتے وقت میرا دل بھر آیا ۔ اور دعا ختم ہونے کے بعد جب میں کلاس روم میں داخل ہوئی ۔ تو میرے قدم سُست تھے ۔ اور دل اُداس تھا ؛

---

۱۵ فروری :-

آج ہمارے اسکول میں ہماری FAREWELL پارٹی
تھی۔ کیونکہ پہلی مارچ سے امتحان شروع ہو رہے ہیں۔ اور امتحان
کی تیاری کے لئے پندرہ چھٹیاں ہوئی ہیں۔

کل آسیہ ہمارے گھر آئی تھی۔ اور اُس نے میری والدہ اور
دادا جان کو منا لیا ہے۔ کہ ان چھٹیوں میں وہ ہمارے گھر پڑھنے
آیا کرے گی۔

آسیہ کو اپنا گھر دکھلاتے ہوئے میرا چہرہ اُداس تھا۔ اُن کا
گھر کس قدر خوبصورت ہے! مگر ہمارا گھر ایسا نہیں ہے کہیں آسیہ
گھر جا کر اختر کو نہ بتا دے۔ اختر بھلا یہاں کیسے آیا کرے گا؟
اس سوچ نے مجھے اداس اور آزردہ کر دیا۔ اور میں سارا دن
اداس رہی۔ خاموش رہی۔ خاموشی سے اسکول کو الوداع کہا۔
الوداع کہتے وقت میرا دل بھر آیا۔ مگر میری آنکھیں خاموش رہیں۔

آسیہ کے ہاں روزانہ جاتی ہوں۔ وہاں پر اتنا جی لگ گیا ہے
کہ بڑی مشکل سے رات گزارتی ہوں۔ اور صبح کو پھر چل دیتی ہوں۔
آسیہ بھی دادا جان پر نہ جانے کیسا جادو پھونک گئی ہے۔ کہ
وہ کچھ نہیں کہتے۔ آسیہ کی امی کس قدر اچھی ہے!

اور اختر کس طرح سارا سارا دن تنگ کرتا رہتا ہے؟۔ ذرا
آسیہ ادھر اُدھر ہوئی۔ اور اُس نے آن کر باتیں کرنا شروع کر دیں
اور ہاتھ چُپ منے لگتا ہے سب بے چین سا ہو جاتا ہے۔ کتنی باتیں

کرتا ہے۔ کہ شادی کے بعد یہ کریں گے۔ وہ کریں گے۔
زندگی کتنی دلچسپ اور کتنی پیاری چیز ہے۔ پہلے میں کتنی
اداس رہا کرتی تھی۔ اُداس تو میں اب بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہوں لیکن
اس اداسی کا کیا ہے! امتحان سر پر آگیا ہے!
پرسوں سے امتحان شروع ہو رہا ہے۔ خدا کرے میں اچھے
نمبروں پر پاس ہو جاؤں —— اب تو پڑھائی میں وہ جی نہیں لگتا جو
پہلے لگتا تھا۔

۱ر مارچ :-

آج جغرافیہ کا پرچہ تھا۔ جو بہت اچھا ہو گیا ہے۔ آسیہ کا بھی اچھا ہو گیا ہے۔

اختر نے بہت بہت مبارک باد دی ہے :

---

۶ مارچ :-

پرچے بہت اچھے ہو رہے ہیں۔ ڈائری لکھنے کی فرصت نہیں
مل رہی۔ امید ہے۔ باقی کے پرچے اچھے ہو گئے۔ تو فرسٹ ڈویژن
آجائے گی۔ خدا کرے۔ ایسا ہی ہو! آمین ——
پھر اختر کس قدر خوش ہو گا!

———

۱۶ر مارچ :-

آج آخری پرچہ تھا۔ آج امی سے اجازت لے کر زندگی میں پہلی بار میں ـــ اختر اور آسیہ فلم دیکھنے گئے۔ درمیان میں اختر تھا۔ ایک طرف میں تھی۔ اور دوسری طرف آسیہ تھی ـــــ

"سہاگ رات" فلم دیکھی۔ فلم مجھے بے حد پسند آئی۔ اور خاص طور پر گیتا بالی کا کیریکٹر۔ مگر اختر اور آسیہ کو یہ فلم پسند نہ آئی۔

رات کو آسیہ مجھے گھر چھوڑنے آئی۔ اور دادا جان سے یہ کہا۔ کہ ان کے گھر مولود شریف تھا۔ اِس لئے دیر ہو گئی۔

دادا جان نے کہا۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ مولود شریف

میں بیٹھنا ثواب کا کام ہے۔ لیکن بیٹی! کاہے کے لئے مولود شریف

کروایا تھا!

امّی نے کہا۔ کوئی کاہے کے لئے مولود شریف کراتا ہے۔

اللہ کا نام کوئی کسی مطلب کے لئے لیتا ہے۔ ٹھیک ہے —

ٹھیک ہے۔

میرا مطلب — اچھا مولود شریف کرایا تھا۔ بیٹھو بیٹی آسیہ۔

اب کچھ دیر تو بیٹھو —

نہیں میں اب جاتی ہوں۔

تو کیا اب اکیلے جاؤ گی!!

نہیں۔ میرا بھائی ساتھ ہے!

تو اُسے بھی اوپر لے آؤ۔

میرا بڑا بھائی ساتھ ہے۔

تو کیا زاہدہ بھی اُس کے ساتھ ہی آئی ہے!

میں ڈر گئی۔

آسیہ نے کہا۔ وہ بہت پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اور ہم آگے آگے آرہی تھیں۔ ماسی زینب بھی ساتھ تھی۔ وہ پرلی گلی کی طرف مڑ گئی ہے

اچھا ــــ

آسیہ چلی گئی۔ مجھے ڈر تھا۔ بعد میں دادا جان کچھ کہیں نہ۔ مگر وہ خاموش رہے۔ اور کچھ دیر کے بعد بولے۔

زاہدہ بیٹی! وہاں مت جایا کر۔ جن کے گھر جوان بھائی ہوں۔ وہاں نہیں جانا چاہیئے۔ اگر تو اب گئی۔ تو یاد رکھ۔ میں تجھے بہت بُری طرح ماروں گا۔

مَیں نے وعدہ کر لیا۔ دادا جان! اب کبھی نہ جاؤں گی ــ اور یوں وہ خاموش ہو گئے۔

کیا مجھے وہاں نہیں جانا چاہیئے۔ ہاں واقعی نہیں جانا چاہیئے کیونکہ پھر بعد میں جب میری شادی وہاں ہو گی۔ تو وہ کہیں کچھ ایسی ویسی بات ہی نہ سمجھ لیں۔ اور شادی کرنے سے انکار کر دیں۔

ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیئے۔ اختر سے تو اب میری ساری زندگی وابستہ ہے۔ اب میں ہمیشہ کے لئے اُسی کی اور صرف اُسی کی ہوں۔

۲۸ر مارچ :-

امتحان کب کے ختم ہو چکے ہیں - اسکول بند ہو چکا ہے سارا سارا وقت گھر پر امی کے ساتھ کام کرواتی رہتی ہوں - آسیہ نے کئی بار بلا بھیجا ہے - مگر نہیں جا سکتی - دادا جان جانے کی اجازت نہیں دیتے - موسم بدل رہا ہے - دھوپ میں کچھ تمازت سی آچلی ہے - جس سے دھوپ میں بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے - چھاؤں میں کبھی نہیں بیٹھا جاتا - بالکل ایسے جیسے نہ اس گھر میں رہنے کو جی چاہتا ہے - اور نہ آسیہ کے ہاں جا سکتی ہوں -

دادا جان کتنے عجیب ہیں۔ کیا بھلا اُن کی یہ بندش میرے دل سے اختر کا خیال نکال سکتی ہے؟

کبھی نہیں کبھی نہیں نکال سکتی۔

پھر کیا ہوا۔ اگر میں اختر سے نہیں مل رہی۔ اُس سے ملے کئی روز ہو گئے ہیں مگر میں اُسے روزانہ یاد کرتی ہوں۔ اور خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ دن جلد آئے۔ جب وہ مجھے بیاہ کر اپنے گھر لے جائے۔ آمین۔ یا خدا! میری اس آرزو کو ضرور پورا کرنا۔ اس کے بعد میں اُس کے ساتھ نئے نئے ملک دیکھوں گی۔ اور ساری دُنیا کا سفر کروں گی۔ اور اپنے بہن بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گی۔ پھر بہت کچھ ہوگا۔

۱۴ر اپریل :-

آج آسیہ ہمارے گھر آئی تھی - وہ چھٹیاں گذارنے کے لئے اپنے UNCLE کے پاس کراچی جارہی ہے - آسیہ میری امّی سے باربار کہتی رہی - کہ زاہدہ کو بھی ساتھ بھیج دو - مگر امی بچاری کیا کرتیں! امی کا ماں ہو کر بھی مجھ پر کوئی اختیار نہیں ہے - جو اختیار ہے وہ صرف دادا جان کا - امی کی قسمت کا مالک بھی دادا ہے - میری میرے چھوٹے بہن بھائیوں کی - اور اپنی محبت کا بھی - ہم کو بھلا کیا کیا اختیار ہے ! ——

اچھی سہیلی آسیہ! تو خوش قسمت ہے۔ تو امیر گھرانے میں پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہوئی ہے۔ تیری قسمت بہت اچھی ہے۔ تُو دنیا میں پھولوں کی طرح زندگی گزارنے کو آئی ہوئی ہے اور ہم لوگ تو صرف رونے اور جلنے کو یہاں آئے ہیں۔ ہمیں کراچی سے کیا! ہمیں تو اپنے ہی شہر لاہور سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں تو اس گلی کے باہر، بلکہ اِس مکان کے باہر کی دنیا سے بھی کوئی علاقہ نہیں؟ بلکہ سچ پوچھو۔ تو اس گھر پر بھی کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور تو کراچی کا کہہ رہی ہے۔ جیسے یہ بھی مکان کی اوپر والی یا نیچے والی منزل پر جانا ہے۔ ہم تو اوپر اور نیچے والی منزلوں میں بھی دادا جان سے پوچھے بغیر نہیں جا سکتے۔ نہ صرف دادا جان سے پوچھنا پڑتا ہے۔ بلکہ ایسے کئی اردگرد دادا جان موجود ہیں۔ جن کا خیال کرنا پڑتا ہے۔

تُو کراچی شوق سے چلی جا۔ مگر تیری بدنصیب سہیلی کہیں نہ جا سکے گی۔ تو کراچی جائے گی۔ گاڑی میں بیٹھ کر عجیب اور انوکھے راستے اور موڑ دیکھے گی۔ کراچی پہنچکر سمندر دیکھے گی۔ مگر میں نہ دیکھ سکوں گی۔ اے زاہدہ! جب تو کراچی جائے گی۔ تو وہاں کی ہواؤں اور سمندر

کو میرا اسلام کہنا۔ سمندر میری ماں کی گود ہے۔ جس میں سو جانا چاہتی ہوں۔ امن اور سکون سے سو جانا چاہتی ہوں۔ کاش! میں سنہری مچھلی ہوتی۔ اور سارے سمندر میں نیلے نیلے پانیوں میں تیرتی پھرتی!

آسیہ! تو خواہ مخواہ اصرار کر رہی ہے۔ مجھے بھلا کس نے جانے دینا ہے ——

آسیہ نے بہت کہا۔ مگر توبہ کر دی جو کہیں دادا جان اجازت دے دیتے۔

پھر آسیہ نے اتنی اجازت لے دی۔ کہ میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر جا سکوں۔ اور شام ہونے سے پہلے پہلے واپس آجاؤں ——

دادا جان نے تاکید کر دی۔ کہ اگر ذرہ سا بھی اندھیرا ہو گیا۔ اور تو نہ آئی۔ تو پھر میں تجھے اِس گھر میں کبھی زندہ نہ رہنے دوں گا۔ بلکہ زہر دے دوں گا۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ اگر ایک لڑکی۔ بلکہ جوان لڑکی رات کو کہیں باہر اپنی سگی ماں کے پاس ہی کیوں نہ رہے! یا کسی سہیلی کے پاس رہے۔ تو پھر وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اِس لئے مجھے پہلے ہی واپس آنا چاہیئے۔ میں نے آنے کا وعدہ کر لیا

اور چلی گئی۔

راستے میں چلتے ہوئے مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے پنجرے سے نکل کر کھلی ہوا میں آگئی ہوں۔

آسیہ نے بازار سے کچھ چیزیں خریدنی تھیں۔ پہلے وہ خریدیں اور پھر ہم گھر گئے۔ اُس کے گھر میں داخل ہوتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ اختر کے سامنے کیسے جاؤں گی! کیونکہ بہت دن ہو گئے تھے۔ اُدھر گئے آسیہ کے کمرہ میں کچھ دیر بیٹھے۔ آسیہ سامان وغیرہ باندھنے میں مصروف ہو گئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا۔ اور اختر بھی آ گیا۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ یہ بتاؤ۔ اتنے روز تک تم آئیں کیوں نہیں! یہ بھی بھلا کیا بات ہوئی! ہم تو روزانہ یاد کریں۔ اور تم آؤ بھی نہ۔ اور اب تو آسیہ جا رہی ہے۔ پھر تو تم بالکل ہی نہ آسکو گی۔ اور اگر ایسی ہی بات ہے۔ تو پھر میں تمہیں آج جانے ہی نہیں دوں گا۔

اور نہ جانے کے خیال نے میرے سامنے موت کو لا کر کھڑا کر دیا۔ بھلا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کہ میں گھر نہ جاؤں!

میں نے اُس سے کہا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ میں گھر نہ جاؤں۔ اور یہاں رہوں۔

ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟

کبھی نہیں ہو سکتا۔

اور اگر میں ایسا کر کے دکھا دوں تو!

میں سہم گئی۔ خدا کے لئے اختر یوں نہ کرنا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

میرے منہ سے اپنا نام سُن کر اختر اس قدر خوش ہؤا کہ میرے ہاتھ کو کئی بار چُوم ڈالا۔ کہنے لگا۔ پہلے یہ وعدہ کر دو کہ تم مجھے اختر نام سے ضرور پکارو گی۔ پھر شادی تک تمہیں یہاں رات نہیں رہنے دوں گا۔

اور میں نے وعدہ کر لیا —— اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میرا ہاتھ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اختر کی پتہ نہیں یہ کیا عادت ہے۔ کہ وہ میرا ہاتھ ضرور چومتا ہے۔ نہ جانے وہ کیوں ایسا کرتا ہے —— مجھے اُس کا ہاتھ چومنا اچھا نہیں لگتا۔ میرے خوابوں کا شہزادہ تو ایسا

نہیں ہے۔ جو بار بار ہاتھ چومے۔ میں اختر کو کہوں گی۔ کہ وہ ایسا نہ کیا کرے۔ شادی کے بعد بیشک چوم لے۔ ابھی چومنا گناہ ہوتا ہے اور پھر محبّت میں بھلا ہاتھ چومنا کیا ہوا! محبت تو ایک بہت پاکیزہ چیز ہے جس میں صرف دو دل ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اور دُور دُور رہتے ہیں۔ اور نہیں لکھا جا رہا۔

امّی آوازیں دے رہی ہیں۔ اب تو لکھنا بھی بہت مشکل ہے دادا جان کہتے ہیں۔ جب تیرے امتحان ختم ہو گئے ہیں۔ تو اب بیٹھ کے کیا لکھتی ہے! اُن سے چھپ کر یہ ڈائری لکھتی ہوں۔ دل کے اندر یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ میں اِن سب باتوں کو لکھتی بھی جاؤں۔ اگرچہ ڈر لگا رہتا ہے۔ کہ کہیں کوئی پڑھ نہ لے۔

ہائے! اگر کوئی پڑھ لے۔ تو غضب ہی ہو جائے۔ لیکن نہیں۔ میں تو اُسے بڑا چھپا کر رکھتی ہوں۔ اور اگر کبھی کوئی ایسا وقت آیا تو اِنہیں جلا کر راکھ کر دوں گی۔

آسیہ چلی گئی ہے۔ اختر نے وعدہ لیا ہے۔ کہ میں کسی نہ کسی بہانے ضرور اُس کے گھر آیا کروں۔ میں نے اُسسے کہا۔ کہ اُس کی امی اور گھر والے کیا کہیں گے۔ کہ آسیہ تو ہے نہیں۔ تو اب یہ آن کر کیوں بیٹھی رہتی ہے؟

تو اختر نے کہا۔ کہ وہ پچھلا دروازہ کھول کر رکھا کرے گا۔ اور میں چپکے سے آن کر چپکے سے چلی جایا کروں۔ مجھے یہ بات بڑی خوفناک لگی۔ بڑا ڈر لگا۔ یعنی چوروں کی طرح آؤں۔ اور چوروں کی طرح جاؤں ـــــ ہائے اللہ! میں تو ایسا کبھی نہ کرسکوں گی۔ کبھی

نہیں ۔ اور میں نے اختر کو صاف صاف کہہ دیا۔ کہ میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔

مگر اختر نے بتایا۔ کہ ایسا کرنے میں بالکل کوئی ہرج نہیں ہے اُس کے کئی ایسے دوست ہیں۔ جنہوں نے اُس کو بتایا ہوا ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ ایک اُس کا دوست سلیم ہے جس کو ایک لڑکی ثریاؔ سے پیار ہے۔ گھر والے ملنے نہیں دیتے۔ اور وہ یوں ہی چھُپ چھُپ کر آجاتی۔ اس میں بھلا کیا ہرج ہے! یہ بات اختر نے مجھے قائل کرنے کو کہی تھی۔ مگر مجھے یہ بات سُن کر اور بھی خوف لگا۔ اور میں یہ کہہ کر "کہ کوشش کروں گی آنے کی" چل دی۔ میں تو ایسا نہ کر سکوں گی۔

رات گئے دیر تک میں سوچتی رہی۔ موسم بہت اچھا ہو گیا ہوا ہے۔ اور مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں بستر پر لیٹی دیر تک اختر کے متعلق سوچتی رہی۔ اختر کچھ عجیب سا لڑکا لگتا ہے۔ نہ جانے کیا ہوگا! اور پھر اس کے دوست کیسے ہیں! وہ کون ثریا ہوگی۔ جو اُسے ملنے جاتی ہوگی۔ چلو ہو جو کوئی بھی ہے۔ مجھے اُس سے کیا۔!

مگر مجھے گھر سے جانے کی اجازت کیسے ملے گی! ——

مجھے دادا جان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ

مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔

نہیں نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں جاؤں گی۔ اور

یہ فیصلہ کر کے میں سو گئی ؛

آج ہمارے ہمسائے کے گھر میں رات بھر قوالی ہوتی رہی بہت سے لوگ جمع تھے۔ عورتیں اور مرد۔ عجب ہنگامہ برپا تھا۔ دادا جان بھی سُننے کو گئے ہوئے تھے۔ آج ہمارے گھر ہمارے رشتے کی ایک پھوپھی جان ہیں۔ وہ آئیں۔ بڑی باتیں کرتی رہیں۔ اُن کو کہیں مکان نہیں ملتا تھا۔ اور وہ بڑی پریشان تھیں۔ دادا جان سے بہت دیر تک میٹھی باتیں کرتی رہیں۔ میرے متعلق بھی کرتی رہیں۔ کہ کہیں رشتہ وغیرہ کیا ہے یا نہیں۔ والدہ نے کہا۔ ابھی تو پڑھ رہی ہے۔ کہتی ہے۔ میں نے شادی نہیں کرنی۔ پڑھ لکھ کر استانی بنوں گی۔

پھوپھی کہنے لگی۔ غضب خدا کا۔ کہیں ہم میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جوان لڑکی کی شادی نہ کی جائے۔ اگر اُسے پڑھایا جائے۔ تیری تو مت ماری ہوئی ہے۔ کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا۔ تمہیں تو اس کی ہاں میں ہاں نہیں ملانی چاہیئے۔ والدہ کہنے لگیں۔ میں تو سمجھاتی ہوں۔ مگر ابھی بچّی ہے نا۔

مجھے اُس کی یہ بات بہت بُری لگی۔ مگر میں خاموش ہو گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے امی سے کہا۔ امّی! اگر آپ نے اسے پھر یہاں آنے دیا۔ تو میں کبھی آپ سے نہیں بولوں گی۔ امّی کہنے لگیں۔ پگلی! اگر وہ یہاں آجائے۔ تو کیا میں اُسے نکال دُوں!

دن گزر رہے ہیں۔ پھوپھی نامراد روزانہ آتی ہے۔ اور اب تو
کل سے وہ باقاعدہ یہاں آن کر رہے گی۔ جب تک اُس کو مکان
نہیں ملتا۔ دادا جان کہتے ہیں۔ یہیں آجائے۔ سُنا ہے اُس کی ایک
فتنہ بیٹی اور ایک رنڈوا بیٹا بھی ہے۔ جس کی دو بیویاں مر چکی ہیں۔
میں نے بہتیرا زور لگایا ہے۔ میں روتی اور چیخی ہوں۔ اور یہاں تک
کہہ دیا ہے۔ کہ اگر وہ یہاں آن کر رہے گی۔ تو میں گھر چھوڑ دوں گی
امی تو چپ چاپ رو دیتی ہیں۔ مگر دادا گالیاں دیتا اور مارتا ہے!
یا خدا! میں کیا کروں! وہ تو ایک فتنہ عورت ہے۔ اور پھر اُس کا بیٹا

یا اللہ ہماری مدد کر!

اس نامراد پھوپھی نے تو کل یہاں تک دادا جان کو کہہ دیا تھا کہ زاہدہ کو میری بیٹی بنا دیں۔ میرا بیٹا تو اب لاٹ صاحب کے دفتر میں نوکر ہو گیا ہے۔ سو روپیہ ماہوار کماتا ہے۔

بڑے بڑے گھر والے اپنی بیٹیاں دینے کو تیار ہیں۔ مگر میں تو اپنے ہی خاندان کی بیٹی چاہتی ہوں۔ جو میرا چولہا بھی سنبھال لے مجھ سے اس بڑھاپے میں پکایا نہیں جاتا۔ اور دادا تو مان بھی گئے تھے۔

یا خدا! یہ کیا بیٹھے بٹھلائے مصیبت آنے والی ہے۔ تیری مدد کرنا۔

کہاں میرے خوبصورت سوئٹزرلینڈ جا کر زندگی بسر کرنے کے خواب اور کہاں اس کا رنڈوا بیٹا۔ جو جب سے لاٹ صاحب کے دفتر میں ..ا روپیہ ماہوار پر نوکر ہوا ہے۔ اور اس نے دھوتی کی جگہ پتلون پہننی شروع کر دی ہے۔ اور سر پر تیل لگا کر ترچھی مانگ نکالنی شروع کی ہے سبھی رشتے دار اپنی لڑکیاں اس کے ساتھ بیاہنے کے خواب

دیکھنے لگے ہیں۔ میرا اور اُس کا بھلا کیا ساتھ! ان لوگوں کو کیا معلوم کہ میرا ذہن کیسا نہیں ہے! میرا تو ان باتوں سے دم گھٹتا ہے۔ جن باتوں سے اِن کا چہرہ کھلتا ہے۔

ہائے! مجھے ایک تنگ سے مکان میں ایک ظالم ساس اور نامراد قسم کے جواری سے خاوند کے ساتھ باورچی خانے کے دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرہ میں بیٹھ کر زندگی بسر کرنے سے تو موت لاکھ بار مبارک ہو!

میں تو کبھی یوں لشتم پشتم کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ میں تو تازہ ہواؤں اور کھلے نخلستانوں کی ہرنی ہوں۔ میں یہاں کیسے آ گئی ہوں۔

یا خدا! تُو نے مجھے کہاں پیدا کر دیا ہے۔ اختر! تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری ناہدہ کن مشکلوں میں نہیں پھنسی ہوئی۔ کیا تم بھی مجھے اِس مشکل سے نہ نکالو گے!!

اختر! اس تاریک اور سیاہ رات کے اندھیرے میں اگر کوئی جگنو چمکتا ہے۔ تو وہ صرف تم ہی ہو۔ صرف تم! ؛

پھوپھی معہ اُس رنڈوے کے ہمارے گھر آ گئی ہے۔ اور نچلی منزل اُسے دے دی گئی ہے۔ آسیہ کا نوکر کل رقعہ لے کر آیا تھا کہ آسیہ کی امی تمہیں بلاتی ہے۔ تم ضرور آؤ۔

جونہی اس کے نوکر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور پوچھا "زاہدہ بی بی ہے؟"

تو پھوپھی اور اُس کے رنڈوے بیٹے۔ دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ بلکہ خود بھی کھڑے ہو گئے۔ کمرہ سے اُٹھ کر ڈیوڑھی میں آ گئے اور چک کے پیچھے سے باہر گلی میں جھانکنے لگے۔ میں نیچے اُتری

نسیمہ بھی ساتھ تھی۔ اُس نے نوکر سے رقعہ لیا۔ میں نے دوسری طرف
لکھ دیا۔ کہ کل آؤں گی۔ اور اُدھر آ گئی۔ دادا جان گھر پر نہیں تھے
کچھ دیر کے بعد وہ آئے۔ تو نیچے ہی بیٹھے رہے۔ پھوپھی نے دادا جان
کو بتایا۔ کہ کسی کا رقعہ آیا تھا۔ اور اِس نے مسکراتے ہوئے لیا۔ اور
اُسے کہا۔ کہ اب تم جلدی سے چلے جاؤ۔ کوئی آ نہ جائے ـــــــ
مگر میں اوپر کھڑی دیکھ رہی تھی ـــــــ ماں تو اس کی اندھی ہے۔
مگر تُو تو یوں عزت نہ بیچ۔ آخر اِس کی اور ہماری دو عزتیں نہیں
ہیں۔ تو اِس کو کہیں باندھ دے اب۔ ورنہ میری یہ بات یاد رکھنا۔
کہ اس لڑکی کے رہنے والے لچھن نہیں ہیں۔ شام کو اکیلی کوٹھے پر
چلی جاتی ہے۔ اور تنہا تنہا بیٹھتی ہے۔ سوچتی رہتی ہے۔ کام کاج
کرتی نہیں۔ مجھے دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیتی ہے۔ کل میں نے
ننھے انجم سے کہا۔ جا بازار سے مجھے جا کر مرچیں لا دے۔ میں نے
دفتر روٹی بھیجنی تھی۔ اور مرچیں کم ہو گئی تھیں۔ میں نے انجم کو
آواز دی۔ کہ جا کر بازار سے لا دے۔ تو اُسے اِس نے سکھا دیا۔
کہ جا کر کہہ دے۔ میں کوئی نوکر نہیں ہوں۔

مَیں نے بھی بھائی! یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے۔ یہ سب ناک کاٹنے والی باتیں ہیں۔ میرا کام تجھے سمجھانا تھا۔ اب سوچ سمجھ کر جلدی سے یہ کام کر ڈال۔

دادا جان بولے۔ دیکھ مجھے میں اِس حرام زادی کا رانوں رات نکاح کر دیتا ہوں۔

پھوپھی بولی۔ خدا کے لئے ابھی اوپر جا کر کچھ نہ کہنا۔ کسی اور بات پر بولنا — ورنہ یہ ماں بیٹیاں کہیں گی۔ کہ اِسے آئے دو دن بھی نہیں ہوئے۔ اور لگی لڑائیاں ڈالنے۔ کیا فائدہ! —— تم آرام سے بات کرنا۔ یا کسی اور بات پر سمجھانا۔ اور پھر نیچے کھُسر پھُسر کی آوازیں آتی رہیں۔

میرا تو دل ہل گیا۔ اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ کہ اب تو وہ وہ کچھ ہوگا۔ جو کبھی نہ ہوُا تھا۔ اور میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ امّی سمجھاتی رہی۔ مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

آج آسیہ کے گھر جانا تھا۔ اختر میرا انتظار کر رہا تھا۔ مگر دادا جان صبح سے ہی ٹھک کر گھر بیٹھ گئے تھے ــــــ میں نے مُنہ ہاتھ دھو کر بال گوندھنے کے لئے کنگھی اٹھائی۔ اور آئینہ کے سامنے جا کھڑی۔ دادا جان نے گھور کر دیکھا۔ اور اُٹھ کر پاس آ گئے۔

کہاں جا رہی ہو ؟

مَیں نے سہم کر ڈرتے ڈرتے کہا:۔

دادا جان جی! میری ایک سہیلی کی ماں بہت بیمار ہے ۔ کل اُس نے اپنا نوکر بھی بھیجا تھا۔ کہ خبر لینے کو ضرور آؤ۔ وہاں جانا ہے۔

دادا جان نے کڑک کر کہا۔

سہیلی کی ماں بیمار ہے۔ یا تیرا یار بیمار ہے۔

خدا کے لئے کچھ تو خیال کرو۔ یوں یار یار کا لفظ منہ سے کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔

امی نے آتے ہی دادا جان کو کہا۔

دادا جان بولے:۔

تُو چپ رہ —

کیوں چُپ رہوں! کیا میں اِس کی ماں نہیں؟

تُو اندھی ہے۔ ماں ہو یا نہ ہو۔ مجھے اِس کا نہیں پتہ۔

اور تیری دو آنکھیں نہیں۔ چھ آنکھیں ہیں۔ آج تو چھ آنکھوں سے ہم کو دیکھ رہا ہے۔ دو تیری اور چار تیرے نچلے کمرہ میں رہنے والے رشتہ داروں کی۔

خبردار! جو تُونے زیادہ بکواس کی۔ تو اُس کو خراب کر کے چھوڑے گی۔ تجھے تو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

اور دادا جان کتنا زیادہ نہیں بڑبڑاتے رہے تھے میں خاموش

ایک طرف بیٹھ گئی - اور جب دادا جان بولتے ہوئے نیچے اُتر گئے تو امی نے آن کر پیار سے کہا - مت جا میری بیٹی تو وہاں - تم نے کہہ دینا تھا کہ میرا دادا بڑا سخت قسم کا آدمی ہے - وہ نہیں آنے دیتا -

اور میں رونے لگ پڑی -

اچھی اماں ! آج مجھے کسی طرح اجازت لے دو - آج میں نے ضرور جانا ہے - مَیں نے اُسے کہلا بھیجا تھا - کہ ضرور آؤں گی - میری سہیلی میرا انتظار کر رہی ہو گی -

لیکن بیٹی ! میں تجھے کیسے بھیجوں !

تیری قسمت ہی ایسی تھی - کہ دہ بھی نچلے کمرہ میں آن بسی ہے تو کچھ روز تک سہیلی کے ہاں جانا بند کر دے - یہ کہیں جالیں - تو پھر چلی جانا -

امی تو یہ کہہ کر کام میں لگ گئیں - اور میں دیوار کے ساتھ منہ لگا کر رونے لگ پڑی - اختر میرا انتظار کر رہا ہو گا - اگر میں نہ گئی تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گا !! میرا دل کتنا نہیں چاہ رہا تھا - کہ بھاگ کر

جاؤں ـــــ ساری دیواریں اور دروازے توڑ کر اس قید خانے سے
بھاگ جاؤں۔ اور اختر کے چوڑے سینے کے ساتھ لپٹ کر رو دوں۔
خوب روؤں۔ اور اُسے بتاؤں کہ میرا ظالم دادا ہم پر کس قدر ظلم
نہیں کرتا۔

وہ مجھے تم سے ملنے نہیں دیتا۔ اگر اُس کو ہمارا پتہ چل گیا تو
وہ ذبح کر ڈالے گا

اچھے اختر! پھر کیا ہو گا! پتہ نہیں کیا ہو گا؟
میں کیسے جاؤں؟ ـــــ

روتے روتے خود ہی چپ ہو گئی۔ اور اُداس سی ہو کر اوپر چھت
پر آن کر لیٹ گئی۔

دوپہر کو امی نے کھانے کے لئے آوازیں دیں۔ مگر میں نے بھلا
کیا کھانا تھا! ہمارے پاس کھانے کو غم جو ہے۔

امیّ نے بہتیرا اصرار کیا۔ مگر میں نے دوپہر کو روٹی نہ کھائی۔ دو
بجے کے قریب دادا جان کے ایک دو اور بوڑھے دوست آ گئے جو
ان کو ساتھ لے کر چل دیئے۔ کہ آج رات خیردین کے گھر دعوت ہے

ابھی چلو وہاں۔ ذرا میلہ رونق رہے گا۔

اوہ اللہ! تو کس قدر اچھا ہے! تو نے میری دعا سن لی ہے پتہ نہیں میری دعا سنی ہے یا اختر کی ـــــ کیا وہ بھی میرا انتظار کر رہا ہے! ـــــ ضرور کر رہا ہوگا۔

میں ابھی جاؤں گی۔ اور اختر کو سارا کچھ سناؤں گی

اور پھر میں جلدی جلدی تیار ہو کر گئی۔

اختر کھڑکی کے ساتھ لگا میرا انتظار کر رہا تھا۔ سیڑھیوں پر مجھے کوئی نہ ملا۔ میں سیدھے اختر کے کمرہ میں چلی گئی۔

وہ اندر بیٹھا تھا۔

پھر اس نے پوچھا۔ کہ میں نے اتنی دیر کیوں لگائی! میری آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں!

اور پھر میں نے رو رو کر اسے سارا حال سنایا۔

وہ یہ سارا کچھ سن کر چپ ہو گیا۔ پھر میں نے اختر سے کہا۔

اختر! اب میں نہ آسکوں گی ـــــ میرا آنا اب ہمیشہ کیلئے مشکل ہے۔

اختر نے مجھے گلے کے ساتھ لگا لیا۔ میرا سارا جسم لرزنے لگا۔
اُس نے مجھے تسلی دی۔ کہ میں کوئی فکر نہ کروں۔ اُس کے ہوتے مجھے
کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ چند روز کے اندر ہی ہمارے گھر رشتہ بھجوا
دے گا۔ اور پھر۔ پھر زندگی اُن کے لئے ایک ایسا دلنشیں خواب
بن جائے گی —— جسے کوئی بھی نہ توڑ سکے۔
اِس بات نے مجھے کس قدر خوشی نہیں بخشی تھی! میں بیان
نہیں کر سکتی۔
پھر ہم کتنی ہی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اختر کس قدر
اچھا ہے!
وہ لمحے کس قدر سہاؤنے اور پیارے تھے۔ جو اختر کے
پاس گزرے۔ اختر مجھے کتنا پیار نہیں کرتا رہا تھا۔ وہ جب پیار
سے میری طرف دیکھتا ہے۔ تو میرا دل اتنی تیزی سے دھڑکتا
ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ آج
اُس نے کئی بار میرے ہونٹوں کو چوما۔ میرے ہاتھوں کو چوما۔ اور ہونٹ
چومتے ہوئے اختر نے بتایا تھا۔ کہ وہ مجھے بے حد چاہتا ہے۔

آج میرے ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی سُرخی پھیلی ہوئی ہے
آج میرے ہونٹ چمک سے رہے ہیں۔ کیا اختر سچ مچ مجھ سے
پیار کرتا ہے!

لیکن پیار کو تو جسم سے کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر اختر ایسا
کیوں کرتا ہے! —— وہ روحانی پیار کیوں نہیں کرتا جس میں ایک
دوسرے کے گلے نہیں لگا جاتا۔ بلکہ صرف ایک دوسرے کو پیار سے
دیکھا جاتا ہے۔ پیار سے سوچا جاتا ہے۔ پتہ نہیں پیار کیا ہوتا ہے!
کیا پتہ ہونٹ چومنے کا نام ہی پیار ہوتا ہوگا۔ اختر کو ٹھیک پتہ ہوگا۔
اختر مجھ سے بڑا ہے۔ اور میں اختر سے کتنی ہی چھوٹی ہوں۔

اچھا اب اگر میں اختر سے ملی۔ تو اُس سے پوچھوں گی کہ اختر!
پیار کیا ہوتا ہے؟ اور پیار کیسا ہوتا ہے؟ ضرور پوچھوں گی۔

لیکن یا خدا! میرے پیار کا علم کسی کو نہ ہو۔ یا خدا! میری مدد
کرنا۔ اِن لوگوں کو اگر پتہ چل گیا۔ تو یہ لوگ مجھے زندہ جلا دیں گے
پھر میں اختر سے کبھی نہ مل سکوں گی۔

پھر اختر میرے بغیر کیسے زندہ رہے گا۔!

نہیں نہیں میں کبھی نہیں مروں گی ۔ میں اختر کے لئے زندہ رہونگی میں اختر سے ہمیشہ پیار کروں گی ۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے ۔ اُسے دیکھ کر مجھے سارا کچھ بھُول جاتا ہے ۔ صرف وہی یاد رہتا ہے ۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے ۔

کچھ روز کے بعد میری اختر سے شادی ہو جائے گی ۔ پھر ہمیں ملنے سے کوئی نہ روک سکے گا ۔ پھر ہم ہمیشہ اکھٹے رہیں گے ۔ ہائے! پھر کس قدر اچھا ہو گا! وہ دن کب آئے گا؟

کل سے میں باقاعدہ اُٹھ کر نماز پڑھا کروں گی ۔ اور خدا سے دعا مانگونگی ۔ کہ میری شادی اُس سے ہو جائے ۔ ہائے! دادا جان کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی ۔ سارے ہمسائے میری قسمت پر حیران رہ جائیں گے ۔ امی جس روز مجھے دُلہن بنے کمخواب کے کپڑوں میں دیکھے گی ۔ تو امی کس قدر خوش نہ ہو گی!

میری نسیمہ بہن اور انجم بھیا! دونوں خوشی سے ناچیں گے میں اِن دونوں کے بغیر اُداس ہو جاؤں گی ۔ میں امی کے بغیر بھی اداس ہو جاؤں گی ۔

پھر کیا ہوگا؟ ـــــ لیکن ہم یہ مکان ہی چھوڑ دیں گے۔ آج میں نے اختر سے کہا تھا نا ـــ کہ اختر! شادی کے بعد میں تمہارے ساتھ ملک ملک کی سیر کروں گی۔ اور ہم ساری دنیا کا چکر لگائیں گے۔ اختر میری یہ بات مان گیا تھا۔ اختر کتنا اچھا ہے!

اچھے اختر! ہمیشہ اچھے اختر رہنا۔ بُرے اختر کبھی نہ بننا۔ ورنہ میں مرجاؤں گی ؎

کل، سارا دن میں بہت خوش رہی تھی ۔ اختر سے پرسوں ملی تھی ۔ پرسوں کا دن خواب معلوم ہوتا ہے ۔ ہر گزرا ہؤا دن خواب کی طرح لگتا ہے ۔ مگر آج میں بہت اداس ہوں ۔ آج ذرہ سی بات پہ دادا جان نے نسیمہ کو اِس بُری طرح مارا ۔ کہ رو رو کر اُس کی آنکھیں سُوج گئی ہیں ۔

اے ظالم دادا ! تجھے اِس معصوم پھول پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے ذرہ رحم نہ آیا !

میری نسیمہ بہن ۔ میری جان نسیمہ بہن ! آ میرے گلے لگ جا ۔

—— یہ ظالم دادا تجھے کبھی نہیں مار سکتا۔ تو مت رو۔ تو مت دُکھی ہو۔

آج نسیمہ نے جب پیار سے یہ کہا تھا۔ کہ باجی! جب آپ کی شادی ہو جائے گی۔ اور آپ یہاں سے چلی جائیں گی۔ تو پھر مجھے کون پیار کرے گا!

پھر دادا جان بہت مارا کریں گے۔

تو میں نے اُسے بہت پیار کیا تھا۔ اور کہا تھا۔ کہ جب تک تو بڑی نہ ہو جائے گی۔ تیری شادی نہ ہو جائے گی میں شادی ہی نہ کروں گی

اور وہ خوش ہو گئی تھی۔

لیکن اس پگلی کو کیا خبر! کہ میری شادی تو بہت جلد ہو جائے گی۔ پھر میں نسیمہ اور انجم کو بہت اچھے انگریزی اسکول میں داخل کرا دوں گی۔ میں ان کو ہوسٹل میں داخل کرا دوں گی۔

مگر نہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو گا! آج دادا جان امی سے پھر رشتہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھوپھی اُدھر آن کر بیٹھی ہوئی تھی میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا۔ اس عورت کی دونوں آنکھیں نکال لوں۔ بھلا میرا اور اس کا کیا ساتھ! یہ تو جب

آگ جلانی ہے۔ اور چولہا گرم کرتی ہے۔ تو سارا کمرہ دھوئیں سے بھر جاتا ہے۔ بہتیرا کہتی ہوں۔ کہ کمرہ کے دروازے کھول دے دھواں باہر نکل جائے۔ مگر دروازے نہیں کھولتی۔ اس کا تو دھوئیں میں بھی بیٹھ کر آنکھ سے آنسو نہیں نکلتا۔ اور میرے تو یونہی بہنے لگتے ہیں۔

ہائے! میری پیاری ماں! کیا تو اپنی بیٹی کو اس دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرہ میں دم گھٹنے کو چھوڑ دے گی!——

پیاری امی! کیا تو میری شادی اس گندے سے میلے سے آدمی سے کر دے گی۔ جو اپنی مونچھوں پر روزانہ تیل کی مالش کرتا ہے اور لاٹ صاحب کے دفتر میں سارا دن گزار کر جب رات کو گھر آتا ہے۔ اور ماں کے گھٹنے کے ساتھ لگ کر روٹی کھاتا ہے۔ اور روزانہ ماں کو کہتا ہے۔ ماں میری اب شادی کر دے۔ ورنہ میں خود ہی کوئی لے آؤں گا۔ پچھلے دنوں اس نے کچھ روپیہ بھی اکٹھا کر لیا تھا۔ جس کا ایک ریڈیو بھی خرید لایا ہے۔ اور اب تو ماں کی خوشی کی کوئی حد ہی نہیں۔ کل اماں سے کہہ رہی تھی۔ ہائے بہن! ایسے گھر میں کون اپنی بیٹی نہ دے گا۔ جہاں ریڈیو بھی ہے۔ اور پھر ایک

ہی اکلوتا لڑکا ہے۔ کل کلاں کو گھر کی یہی مالک ہوگی۔ میرا کیا ہے۔ چند روز کی زندگی ہے۔ یہ گھر آگئی۔ تو میرے بھی آخرت اچھی ہو جائے گی۔ چین سے دن گزار لوں گی۔ اور سنو بہن! اب مکان کرائے پر کیا لینا! ——— اب تو کچھ روز تک بٹیا مکان خود ہی خرید لے گا۔ چاچی عائشہ کی گلی میں ایک مکان خالی ہوا ہے۔ اس کی بات چیت ہو رہی ہے۔ پکی ہو گئی۔ تو انشاء اللہ یہ مکان لے ہی لیں گے۔

اور میری اماں ہوں ہاں کرتی رہیں۔ وہ تو یہاں بالکل میری شادی نہیں کرنا چاہتیں۔

مگر دادا جان کو کون منائے؟

اختر سے ملے کئی روز ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے اختر سے
کبھی نہیں ملی تھی۔ کبھی نہیں۔ میری سہیلی سعیدہ آج آ گئی۔ کہ چلو قدسیہ
کے ہاں جا کر اپنا نتیجہ معلوم کرتے ہیں۔ کہ پاس ہو گئے ہیں یا فیل
کیونکہ اُس کا بھائی یونیورسٹی میں ہے۔ اور ہم نے رول نمبر اسے
دیئے ہوئے تھے۔ آج ۶ مئی ہے۔ دس مئی کو ہمارا نتیجہ شائع
ہو جائے گا۔ آج سے ۴ روز کے بعد۔

دادا جان گھر پہ نہیں تھے۔ امی کو کہہ کر میں سعیدہ کے ساتھ
قدسیہ کے ہاں گئی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ کہ خدا جانے یہ کیا خبر سنائیگی۔

اُس نے آتے ہی مبارک باد دی۔ اور مجھے دوہری دوہری مبارک دی کیونکہ میرے ۶۵۶ نمبر آئے تھے۔ اور میں کلاس میں فرسٹ آئی تھی۔ اور مجھے وظیفہ بھی ملا تھا۔

ہائے اللہ! یہ خبر اتنی اچھی تھی۔ کہ مجھے یوں لگتا تھا۔ جیسے میری جھولی میں چاند ٹوٹ کر آن گرا ہے۔ آسیہ فیل ہو گئی تھی۔ جہاں ایک خبر نے مجھے خوشی پہنچائی تھی۔ وہاں دوسری خبر نے مجھے اداس کر دیا ——

اب میں اختر کو جا کر سب سے پہلے یہ خوش خبری سنانا چاہتی تھی۔ مگر —— یہ خیال۔ کہ وہ آسیہ کا سن کر اُداس ہو گا۔ مجھے اداس کر رہا تھا۔

بہر حال —— میں بغیر کوئی فیصلہ کئے سیدھے اس کے گھر کی طرف بڑھتی گئی۔ راستے میں سوچتی گئی۔ کہ آسیہ کے فیل ہونے کا کس طرح افسوس کروں گی۔ مجھے افسوس کرنا نہیں آتا تھا۔

ایک دفعہ میری ایک پیاری سہیلی شکیلا مر گئی تھی۔ حالانکہ وہ میری بے حد عزیز سہیلی تھی۔ مگر چونکہ مجھے افسوس کرنا نہیں آتا تھا

اِس لئے مَیں اُن کے گھر ہی نہ گئی۔ نہ اُس کا آخری دفعہ منہ دیکھا۔ بلکہ گھر ہی میں روتی رہی۔

آسیہ کا گھر آگیا۔ سیدھی اختر کے کمرہ کی طرف بڑھی۔ دروازہ بند تھا۔ تالا لگا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔ کہ اتنی مشکل سے آئی تھی۔ نہ جانے اب آنا کب ہو۔ تو کیا کہ دوں؟ ــــ ابھی میں کھڑی یہی سوچ رہی تھی۔ کہ اختر آگیا۔

مجھے دیکھ کر اُسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کہ میں آگئی ہوں۔ پھر ہم اندر جا کر بیٹھ گئے۔ اور پھر میں نے اُسے اپنے پاس ہونے کا بتایا۔ اور آسیہ کا بھی بتایا۔ آسیہ کے فیل ہونے کا سُن کر اُس نے ذرہ سا بھی منہ نہ بنایا۔ بلکہ کہنے لگا۔ پھر کیا ہوا؟ اگلے سال پاس ہو جائیگی۔ اور میرے نمبروں کا سُن کر تو وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ کہنے لگا۔ بتاؤ کیا تحفہ لو گی؟ مَیں نے کہا۔ کچھ نہیں لوں گی۔ کچھ نہیں۔ اُس نے بہت اصرار کیا۔ تو میں نے کہا۔ اپنی تصویر دے دینا۔ اور اُس نے مجھے ایک بہت پیاری تصویر دے دی۔ مگر یہ پوچھا۔ کہ رکھو گی کہاں!

میں نے کہا۔ کہ اپنے کپڑوں کے صندوق میں۔

اور وہ ہنس پڑا۔

پھر وہ کہنے لگا۔ کہ اب تو تم کالج داخل ہو گی۔

مگر میں یہ سُن کر بہت اُداس ہو گئی۔ بھلا میں کہاں کالج میں داخل ہو سکتی ہوں! یہ تو خواب میں بھی ممکن نہیں ––– میں نے اُسے بتایا کہ دادا جان مجھے کسی قیمت پر بھی کالج میں داخل نہیں کرنا چاہتے۔ اب تو وہ میری شادی کر رہے ہیں۔ اور پھر میں نے اُسے لڑکے کا بھی بتا دیا۔

اختر یہ سُن کر چپ ہو گیا ––– اور تھوڑی دیر کے بعد پھر خود ہی بولا۔ کہ میں آج رات امی سے بات کر لوں۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ تم کم از کم بی۔ اے ضرور کر لو۔ اس کے بعد شادی کریں گے۔ ہم منگنی اب کر لیں گے اور شادی چار سال کے بعد۔ میں آج رات امی سے بات کر دوں گا۔ تاکہ وہ پیغام لے کر تمہارے کالج میں داخلہ سے پہلے پہلے منگنی کی بات پکّی کر لیں۔ پھر تو تمہارے دادا جان کو پڑھانے میں کوئی عذر نہیں ہو گا نا –––

مگر مَیں نے کہا۔ اختر! تمہاری امّی کیسے مانیں گی! ـــــ

مگر اختر نے کہا۔ تم اِس کا کوئی خیال نہ کرو۔ اِس کے بعد میں دو تین گھنٹے اختر کے پاس رہی۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا رہا کبھی میری آنکھوں کی تعریف کرتا تھا۔ اور کبھی میرے لمبے بالوں کی۔ کبھی میرے بھولے بھالے چہرہ کی۔ اور کبھی میری سادی طبیعت کی۔

آج پاس ہونے کی خوشی میں اُس نے مجھے بہت پیار کیا۔

واپسی پر گھر آتے ہوئے میں نے اُسے پھر کہا۔ اختر! داخلے تو کل شروع ہو رہے ہیں۔ دس روز تک رہیں گے۔ تم دس دنوں تک بات پکی کر لینا۔ ورنہ بہت بُری بات ہوگی۔

اور اختر نے پکّا وعدہ کر لیا۔ اور پھر میں گھر آگئی۔

بہت دیر ہو گئی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ مگر آج مجھے کوئی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ آج میں نے پاس ہونے کی خوش خبری گھر میں سنانی تھی۔ آج بے شک دیر ہو جاتی۔

گھر آتے ہی امی کو یہ خبر سُنائی۔ دادا جان کو بتایا۔ دادا جان

کا غصہ سے تنا ہوا چہرہ خوشی کے لطیف جذبات میں بدل گیا۔ اور
انہوں نے زندگی میں پہلی بار مجھے بہت پیار کیا۔ اُن کے پیار
کرنے سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اور میں رونے لگ پڑی۔
دادا جان حیران ہو گئے۔ کہ خوشی کے موقعہ پر یہ آنسو کیسے؟
اے دادا! تجھے کیا خبر! کہ تیرے اتنا سا پیار کرنے سے میرا
دل کیا نہیں ہو گیا! —— میرے ذہن میں تو تیرا تصور ایک ظالم
دادا سے زیادہ نہیں تھا۔ کہ آج تُو نے بھول کر پیار کر کیسے دیا!
پھوپھی اور اُس کے لڑکے کو بھی پتہ چلا —— پھوپھی بولی ۔
کسی کو کچھ دے دلا کر پاس ہو گئی ہو گی —— آنی جانی تو رہتی
ہے ۔ رقعے بازی بھی ہوتی رہتی تھی ۔
اُس کی اِس بات نے میرا دل جلا کر راکھ کر دیا ۔ رات امی
بھی بہت خوش تھی۔
رات گئے جب سب سو گئے ۔
نیلے آسمان کی تاروں سے بھری ہوئی چھت کے نیچے جب
ہم سب لوگ بیٹھے ۔ اور صرف میں اور امی جاگتی رہ گئیں ۔ تو امی

نے کہا:

بیٹی! اب میں چاہتی ہوں۔ کہ میرے جیتے جی تیری شادی ہو جائے — تم نے میرا حال دیکھا ہے۔ دن بدن موت کے قریب ہوتی جا رہی ہوں۔ اور پھر رشتہ دار بھی طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں تمہیں پتہ ہے۔ ہمارے خاندان میں کوئی پڑھا لکھا شخص تو ہے نہیں۔ تو زیادہ پڑھ گئی۔ تو شادی کے لئے مشکل ہو جائے گی ہم غریب لوگ ہیں۔ اور پھر ہمارے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں ہے۔ کہ تجھے آگے پڑھا سکیں۔

مَیں نے کہا۔ امیّ! مجھے تو ۲۵ روپے ماہوار وظیفہ بھی ملیگا فیس کی اب کوئی فکر نہیں۔ وہ معاف ہو جائے گی۔ اور ۲۵ روپے ہر مہینے مفت ملا کریں گے۔

اچھی ماں! میں نے ابھی شادی نہیں کرنی۔ میں جب تک کوئی اچھا لڑکا نہ ہوگا۔ شادی نہیں کروں گی۔

امی کہنے لگی۔ اس پھوپھی کے لڑکے سے تو میں تیری شادی نہیں ہونے دوں گی۔ مگر خالہ زینب کا لڑکا جو بنک میں نوکر ہے۔ میٹرک

پاس ہے ۔ اور دو سو روپیہ تنخواہ لیتا ہے ۔ وہ بڑا نیک لڑکا ہے ۔ میں چاہتی ہوں ۔ وہاں تیری شادی کر دوں ۔ شادی کے بعد تم بیشک آگے پڑھ لینا ۔

میں نے کہا ۔ اچھا امی ! شادی کر لوں گی ۔ مگر یہاں نہیں میں اپنی مرضی آٹھ روز کے بعد بتاؤں گی

اور امی مطمئن ہو کر سو گئیں ۔

میں اندر ہی اندر ہنستی رہی ۔ بھلا میں امی کو خود ہی کیسے بتا دیتی امی کو خود ہی کیسے بتا دیتی ۔ امی کو پتہ چل جائے گا ۔ کل یا پرسوں تک آسیہ کی امی ضرور آئیں گی ۔

کہیں وہ ہمارا غریب سا گھر دیکھ کر بُرا نہ منا لے ـــــ اگر کہیں ایسا ہو گیا تو ! ـــــ

مگر نہ جانے یہ ایسے منحوس خیال کیوں میرے دل میں آنے لگ جاتے ہیں ۔ توبہ ۔ بھلا اختر کی بات اُس کی امی کبھی ٹال سکتی ہیں ! کبھی نہیں ۔

اور یہی سوچتی ہوئی مجھے نیند سی آنے لگی ـــــ اس وقت رات

کے ۹ بج چکے تھے۔ دُور کہیں ریڈیو پر فرمائشی پروگرام نشر ہو رہا تھا ـــــ ریکارڈ بج رہا تھا ـــــ

آئی۔ آئی شام سہانی ـــــ

سن لے خوشی کی کہانی　　　سُن لے خوشی کی کہانی

بڑی ہی پیاری ہوا چل رہی تھی ـــــ موسم بڑا سہانا تھا ـــــ اس موسم میں سکھ اور سکون کی نیند آنکھوں میں لئے خاموشی سے سو گئی ـــــ کیونکہ سونے کے بعد میں نے بڑے پیارے پیارے خواب دیکھنے تھے:

چھ روز ہو گئے ہیں۔ مگر اختر نے ابھی تک اپنی والدہ کو نہیں بھیجا۔ نہ جانے کیا بات ہو گئی ہے! کیا آسیہ کے فیل ہونے کا اُسے صدمہ ہوا ہے! ـــــ کیا اس کی امی بیمار ہو گئی ہے! نہ جانے کیا بات ہوئی ہے! اختر نے بھیجنے کا پکا وعدہ کیا تھا۔ اختر جھوٹ نہیں بول سکتا۔

پھر کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا!

اچھا کل دادا جان کام پر جائیں گے۔ تو جا کر پتہ لونگی۔ کیونکہ ایک دو روز تک تو پھر داخلے بند ہو جائیں گے۔

آج میں آسیہ کے ہاں گئی۔ پتہ چلا کہ اختر آسیہ کو لینے کراچی گیا ہؤا

ہے۔ یہ سن کر میری جان میں جان آگئی۔ اور میں خوش ہو گئی۔

اس کی امی کہتی ہو گی۔ میں اکیلی کیسے جاؤں! آسیہ کو لے آؤ

اکٹھے جائیں گے۔ ایک دو روز تک اختر ضرور آجائے گا۔

میں لیٹ فیس دے کر کالج میں داخل ہو جاؤں گی۔ پھر میں

گھر آ گئی۔ اور مطمئن ہو گئی ⁂

داخلے بند ہو چکے ہیں مگر اختر ابھی تک نہیں آیا۔ اُسے گئے ۲۰ روز ہو گئے ہیں۔ اختر کیوں نہیں آیا؟

اختر کہیں بیمار تو نہیں ہو گیا؟

اچھے خدا! اختر کو بہت جلد واپس لے آ۔

یا خدا! میری دعا سُن لے ——

———

اختر ابھی تک نہیں آیا۔ چار روز اور بیت گئے ہیں کل میں
ضرور اس کے گھر جا کر پتہ کروں گی ——

موسم کس قدر بُرا آگیا ہے! گرمیوں کا موسم مجھے بہت زہر
لگتا ہے —— بہت دُکھ دیتا ہے۔ ہمارے پاس نہ بجلی کا پنکھا
ہے۔ نہ خس کی ٹٹیاں ہیں۔

یا خدا! یہ گرمیوں کا موسم کیسے بیتے گا؟ کالج گرمیوں کی
چھٹیوں کے لئے بند بھی ہو چکا ہے۔ دادا جان کی کس قدر منتیں
نہیں کیں۔ مگر وہ نہیں مانے۔ دادا جان کبھی نہ مانیں گے۔

کالج اب ستمبر میں کھلے گا۔

ہائے! مجھے پڑھنے کا کس قدر شوق ہے۔ تو پھر کیا کروں گی!

لیکن نہیں۔ میں ضرور داخل ہوں گی۔ چاہے کچھ ہو جائے۔

ضرور داخل ہوں گی۔

اختر! تم کہاں چلے گئے ہو! تم نے کچھ بتایا بھی نہیں۔ اور چلے گئے ہو ——

کتنا اچھا ہو۔ جو میں کل گھر میں داخل ہوں اور تم آجاؤ ——

کیا تم مجھے کل ملو گے نا! —— اچھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ سچے دل ضرور ملتے ہیں۔ میں دیکھوں گی تم مجھے ملتے ہو یا نہیں۔

آج میں آسیہ کے ہاں گئی۔ تو اختر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میرا جی چاہتا تھا۔ بھاگ کر اُس سے لپٹ جاؤں۔ اور پھر رو رو کر کہوں۔ کہ تم کہاں چلے گئے تھے اختر ——

اختر اتنے روز کہاں رہے ہو —— تم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا —— جاؤ —— میں تم سے نہیں بولتی —— مگر میں خاموش رہی ——

اختر نے مجھے دیکھتے ہی معذرت پیش کرنی شروع کر دی کہ آسیہ کی تار آ گئی تھی۔ کہ وہ گر پڑی تھی۔ میں فوراً گیا۔ اُسے ہسپتال

داخل کرایا۔ اور اب کہیں جا کر وہ کچھ ٹھیک ہوئی ہے۔ میں نے بہت فکر کا اظہار کیا۔ آسیہ کا ایڈریس لے لیا۔ تاکہ اُسے خط لکھوں۔ مگر اختر نے کہا۔ کہ خط میں چوٹ وغیرہ کا بالکل ذکر نہ کرنا۔ اُس نے مجھے منع کیا تھا۔ کہ میں تمہیں نہ بتاؤں۔ کیونکہ تم فکر کرو گی۔

میں حیران ہو گئی۔ آسیہ نے یہ بات کس جذبہ کے تحت کی ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

اس کے بعد اختر بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ سفر کی باتیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ پھر پیار کرتا رہا۔ مگر شادی اور کالج کی کوئی بات اس نے نہ کی ——— میں نے بھی بات کرنی مناسب نہ سمجھی۔ اور آ گئی۔ میرا دل بہت اداس اور پریشان تھا ———

اختر نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ کہ میں ہفتے میں ایک روز اُسے ضرور ملنے آؤں ——— پھر وہ مجھے بہت سی باتیں بتائیگا۔

گھر آن کر میں نے امی کو آسیہ کا بتایا۔ کہ وہ گر پڑی ہے امی نے بھی بہت افسوس کا اظہار کیا۔ امی بازار سے کپڑا خرید کر لائی تھیں۔

پھر میں نے بیٹھ کر شام تک نسیم اور انجم کی قمیضیں تیار کیں

میں اپنے خیالوں میں۔ اور قمیضوں کے سینے میں اس قدر محو ہوئی،

کہ مجھے شام ہونے کا پتہ ہی نہ چلا۔

دونوں کے لئے ساتھ کی ہمسائی سے مشین مانگی ہوئی ہے

کل اور پرسوں دونوں دن بیٹھ کر سارے کپڑے تیار کرنے ہیں

گرمیوں میں موٹے کپڑے نہیں پہنے جاتے۔

پندرہ روز گزر گئے۔ میں آسیہ کے ہاں نہیں گئی۔ حالانکہ اختر نے ہر ہفتے آنے کو کہا ہوا تھا۔ میرا دل کتنا اداس اور غمگین ہے۔
دادا جان ستمبر کے مہینے میں میری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔
نہ جانے کیا ہونے والا ہے! کیا اختر کو اس چیز کا خیال نہیں ہے، میں اختر کو ساری بات بتا چکی ہوں۔ اب بار بار کیا بتاؤں!——
اچھا کل آخری بار اُسے جا کر ضرور کہوں گی۔ کہ ستمبر میں میری شادی ہو رہی ہے۔

آج میں اختر کے ہاں گئی۔ تو وہ سامان باندھنے میں مصروف
تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میرا دل دکھ سا
گیا ــــــ میں چند منٹ کھڑی رہی۔ اور پھر واپس آنے لگی۔ تو اُس
نے آواز دیکر ٹھہرا لیا ــــــ
کہنے لگا میں تم سے خفا ہوں۔ تم اتنے روز کیوں نہیں آئیں؟
میں تمہیں روزانہ یاد کرتا تھا۔ روز تمہارا انتظار کرتا تھا۔ مگر تم کس قدر
ظالم اور بے وفا ہو۔ میں نے کہا۔ ظالم اور بے وفا میں ہوں یا آپ!
کیوں میں کیسے ہوں! میں اگر تمہارے گھر آسکتا تو تم دیکھتیں۔

کہ روزانہ آنا۔ بلکہ وہیں رہنا۔

اچھا۔

ہاں۔ تو کیا تمہیں شک ہے!

نہیں۔ بالکل نہیں۔ آپ نے روزانہ آنے کو ٹھیک ہی تو کہا ہے

اچھا آسیہ کا حال بتائیں۔ وہ کیسی ہے؟

اب تو بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔

اور یہ سامان کیا باندھا جا رہا ہے؟ کہاں بھاگنے کا ارادہ ہے؟

بھاگنا کہاں ہے؟ کوہ مری جا رہا ہوں ــــــ یہاں گرمی میں نہیں رہا جاتا ــــــ ستمبر میں واپس آنے کا ارادہ ہے چلو گی تم بھی ساتھ!

میرا دل بھر آیا تھا۔ اور میں بول نہ سکتی تھی۔ میں نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور خاموشی سے زمین کو تکنے لگی۔

بولو کیا چلو گی میرے ساتھ؟

نہیں۔

کیوں؟

میری مرضی!

کیا مجھ سے خفا ہو؟

لڑائی کب ہوئی تھی؟

نظر تو ایسے ہی آتا ہے ——

نظر ویسے بھی آسکتا ہے۔

یہ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟

مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔

پھر اختر اُٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ اور ہاتھ سے میرا چہرہ پکڑ کر اُدھر کرنے لگا۔ میں نے کہا:

مجھے نہ ہاتھ لگانا۔

اختر نے ہنس کر کہا۔ کیوں؟ یہ کیا ہو گیا؟

مجھے ہاتھ لگانا اچھا نہیں۔

سیدھی طرح کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ کہ تم اب اچھے نہیں لگتے اب کوئی اور اچھا لگتا ہو گا۔

میں تڑپ اُٹھی۔ اور کہا۔ ایسی بات پھر کبھی نہ کہنا۔

یہ کوئی اتنی بُری بات نہیں ہے۔

تمہارے لئے بالکل معمولی بات ہوگی۔ مگر میرے لئے یہ بُرائی کی آخری بات ہے۔

بھئی کمال ہے۔ تم بھی حد کرتی ہو۔ مذاق کی بات کو اتنا (SERIOUS) لے لیتی ہو۔

مذاق کا بھی کوئی وقت ہونا چاہیئے۔

وقت تم بتا دو ـــــ میں نے تو یونہی بات کر دی تھی۔

اچھا تو میں چلتی ہوں۔

ابھی نہیں جا سکتیں۔

کیوں ؟

بس۔ میری مرضی !

تم کون ہو ؟

میں تمہارا اختر ہوں۔

تم میرے کچھ بھی نہیں لگتے۔

لیکن پہلے تو کچھ لگتا تھا۔

میں کچھ نہیں جانتی ۔

مگر زاہدہ! تمہارا مزاج کیوں خراب ہو گیا ہے ۔ بتاؤ نا۔ تمہیں کیا ہوا ہے ؟

میں چند لمحے خاموش رہی ۔ اور جب اُس نے دوبارہ میرا چہرہ پکڑ کر اُدھر کیا ۔ تو میرا منہ چومنے لگا ۔ تو میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی ۔ اور دیوار کے ساتھ منہ لگا کر سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی ۔ اور پھر اتنے آنسو بہے ۔ کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں ۔ اختر بہتیرا چپ کراتا رہا ۔ مگر میرے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے ۔

پھر اختر نے مجھے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا ۔ اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا ۔ اور پوچھا ۔

بتاؤ ۔ کیوں رو رہی ہو ؟

مجھے کچھ نہیں ہوا اختر ۔

تو تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہو ۔

بلکہ یہ کہنا چاہیئے ۔ کہ اختر اب تم مجھے بیوقوف نہ بنا سکو گے تم اچھا بھلا جانتے ہو ۔ اور پھر یہ کہتے ہو ۔

بھئی زاہدہ! دیکھو۔ سیدھی سیدھی بات کرو۔ دیکھو۔ میری طرف دیکھو۔

کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں!

نہیں بتاؤں گی۔—

اچھا نہ بتاؤ۔ میں جانتا ہوں۔ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔

تم غلط جانتے ہو۔ میں پیار نہیں کرتی۔

اچھا۔ تو لو۔ یوں کہہ لو۔ کہ اختر تمہیں پیار کرتا ہے۔

ہاں اختر مجھے پیار کرتا ہے۔ اور میں زاہدہ اختر کو پیار نہیں کرتی۔ اور اختر اِس قدر پیار کرتا ہے۔ کہ اُس کے پیار سے میری آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ ہیں نا!

تو کیا تمہیں شک ہے! اچھا لو۔ آؤ سارا غصہ تھوک دو۔ بھلا جانے سے پہلے مجھ سے کیوں خفا ہوتی ہو۔ کیا پتہ میں ہی مر جاؤں۔ اور واپس ہی نہ آؤں۔ پھر!— پھر تو تم بہت خوش ہو گی۔

ہاں— خوش کیوں نہیں ہونا اختر!— تمہاری یہ دکھی کر دینے والی باتیں۔ میں کبھی فراموش نہ کروں گی۔

توکیا تم کو میرے مرنے کا افسوس ہوگا۔

توکیا تم نہیں جانتے۔ کہ مجھے افسوس ہوگا!

تمہیں کاہے کا افسوس ہوگا؟

اچھا نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا۔ اس بات کا تمہیں بہت جلد یقین آگیا ہوگا۔ ہیں نا۔

بس اس طرح بہت بحث ہوتی رہی۔ پھر میں خاموش ہوگئی۔ میں نے اُسے ایک بار بھی نہ کہا۔ کہ تم نے تو ہمارے گھر پیغام بھیجا تھا۔ اور یہ کہ میری شادی ستمبر میں ہو رہی۔ اور تم ستمبر میں کوہ مری بیٹھے ہوگے۔ پھر میں نے کہا۔

اختر! کیا تم میری شادی پر آؤ گے!

تمہاری شادی پر نہیں آنا۔ تو اور کس کی شادی پر آنا ہے!

اچھا۔

کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟

ستمبر کے آخر میں۔

کالج میں داخل نہیں ہو گی؟

نہیں۔ دادا جان بالکل اجازت نہیں دیتے۔ وہ تو ایک جگہ بات "پکی" کر رہے ہیں۔

تو تم نے انہیں منع کیا ہوتا۔

میری بات بھلا کون سنتا ہے؟

اختر کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

میں نے امی سے بات کرنی تھی۔ مگر ان دنوں امی کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ ستمبر میں میں آن کر سارا کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ پھر میں امی کو منا لوں گا۔

میں خاموش رہی۔

پھر اختر کتنی ہی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا کبھی گانے لگ جاتا کبھی چیزیں اکٹھی کرتا۔ کبھی مجھے پیار کرتا۔ بس یونہی وقت گزر گیا۔

پھر اختر نے خدا حافظ کہا۔ اور کہا۔ کہ اچھا ہوا۔ جو تم آج آ گئیں ورنہ میں نے دو تین مہینوں کے بعد ملنا تھا۔

اور پھر میں آ گئی۔ میں سارا راستہ روتی رہی۔ نہ جانے کیوں

اُس کے گھر سے باہر نکلتے ہی میری آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ اُبل پڑا ـــــ اور پھر آنسو رُکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے ـــــ بڑی مشکل سے میں نے گھر کے قریب پہنچکر آنسو خشک کیئے۔ گھر میں داخل ہوئی۔ تو ڈیوڑھی کے پاس ہی پھوپھی کھڑی تھی۔ اُس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں اُدھر آ گئی۔ اور چپکے سے کوٹھے کے چھت پر جا کر لیٹ گئی۔ امی نے پوچھا۔ کیا ہوا تجھے!

میں نے آواز کو درست کر کے بڑی چہک کر کہا۔ جیسے بہت خوش ہوں۔ امّی! بالکل ٹھیک ہوں۔ کچھ نہیں ہوا۔ اور میں خاموشی سے دیوار سے ٹیک لگا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اور سامنے خلاء کو گھورنے لگی۔ آج میرا دل کس قدر ویران تھا! یہ میں بتا نہیں سکتی۔ میری زندگی کے چمن میں بہار آنے سے پہلے ہی رخصت ہو گئی۔ میری خوشی کا پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔ مجھے اپنے چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آئی۔ یہ کیا ہو گیا۔؟

وہ کیسی صبح ہوئی تھی۔ جس کی اتنی جلدی شام بھی ہو گئی!

وہ روشن دن کدھر ڈوب گیا؟

کیا ہونا تھا۔ اور کیا ہو گیا؟

اختر نے تو کوئی بھی پرواہ نہیں کی۔ اختر نے تو وہ جوش و خروش دکھایا ہی نہیں۔ جس کا اُس نے شروع میں یقین دلایا تھا۔

اب کیا ہوگا؟

اختر جا رہا ہے۔

کل وہ کوہ مری پہنچ جائے گا۔ خوبصورت اور سرد پہاڑوں پہ وہ کل کی رات سکھ اور چین سے سوئے گا —— مگر مجھے کیسے نیند آئے گی!

میں اختر کو جانے سے کیسے روکوں!؟

میں نے تو اُسے ایک بار بھی نہ روکا —— شاید وہ رُک جاتا —— لیکن شاید وہ نہ ہی رُکتا۔ لیکن میں اُسے ایک بار تو کہہ لیتی۔ شاید وہ نہ ہی جاتا۔

اختر! مت جاؤ —— میں یہاں تین مہینے کیسے گزاروں گی اگر جانا ہی ہے۔ تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ اختر! میں کیسے زندگی کے دن گزاروں گی۔ اور پھر میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ شام

ہوتی گئی ——

اندھیرے کا سمندر ہر چیز کو لے کر ڈوب گیا۔

مگر میں بالکل بے حس و حرکت اوپر لیٹی رہی ——

پھر امی نے بہت آوازیں دیں۔ تو اُٹھ کر نیچے آئی —— اپنا چہرہ چھپاتی رہی۔ اپنا دُکھ چھپاتی رہی۔ کس کو سُناتی ؟ یہ دکھ کسی نے دیا نہیں دیا۔ خود ہی مول لیا۔ اس دُکھ کو کیسے بتاتی ؟ اس دُکھ کا کیا نام تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی۔ روشنی کی طرف سے پیٹھ کر کے اندھیرے کی طرف منہ کر کر کے بیٹھتی رہی۔

ہنسی مذاق کی باتوں پر بے تحاشا ہنستی رہی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آنسو بھی پونچھتی جاتی تھی۔

آج میں ان لوگوں کے درمیان سب سے اس دل اور ویران چہرہ لئے بیٹھی تھی۔ میرا دل دُکھ گیا تھا۔ مگر کسی کو علم نہیں۔

سامنے دادا جان بیٹھے اپنے کاغذوں کو دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے الماری کھولی ہوئی ہے اور چہرے کے ساتھ کاغذوں کو لگائے پڑھ رہے ہیں۔

نسیمہ نل سے پانی لا کر حمام کو بھر رہی ہے۔ انجم بازار سے کچھ خریدنے گیا ہوا ہے۔ والدہ باورچی خانے میں بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہے۔

میری امی کتنی کمزور ہو گئی ہیں! ——

ان کا رنگ کتنا زرد ہوتا جا رہا ہے ——

پتہ نہیں ان کو کیا ہو گیا ہے! ابا کے مرنے کے بعد سے تو ان کی حالت دن بدن ابتر ہوتی جا رہی ہے ——

ڈاکٹر نے کام کرنے کو بالکل منع کیا ہوا ہے۔ مگر پھر بھی کرتی ہیں ——

میری امی! میں کل سے تمہیں کوئی کام نہ کرنے دوں گی۔ میں سارا کام خود کروں گی ——

میری امی! تم نہیں جانتیں —— مگر تمہیں کیا معلوم۔ کہ تمہاری زاہدہ اس وقت کتنی آزردہ بیٹھی ہے۔

لیکن کیا پتہ۔ اختر ستمبر میں کوشش کر ہی دے۔ آتی دفعہ اُس نے مجھے کتنی زیادہ تسلی نہیں دی تھی۔ میں ہی پاگل ہوں۔ جو یوں سوچتی ہوں۔ میں تو خواہ مخواہ رونے لگ پڑی تھی۔ اب نہیں

روؤں گی ۔ اور ستمبر کا انتہائی صبر اور حوصلے سے انتظار کروں گی ۔ دادا جان شادی کی بات پکی کریں گے ۔ تو میں اُنہیں کسی نہ کسی طرح ٹال دوں گی ۔

اچھے خدا! تم میری مدد کرنا ۔ ضرور کرنا ۔

دن گزر رہے ہیں۔ صبح ہوتی ہے اور شام ہو جاتی ہے۔ رات ہوتی ہے اور پھر صبح ہو جاتی ہے۔ کئی روز گزر گئے ہیں۔ اختر کو پچیس روز ہو گئے ہیں۔ اُس نے مجھے کوئی خط بھی نہیں لکھا مگر وہ لکھ بھی کیسے سکتا تھا! ـــــ ہمارے گھر میں تو خط آ ہی نہیں سکتا۔ اگر کہیں کوئی ڈاکیہ میرے نام کا خط لے کر آ جائے۔ چاہے وہ میری کسی سہیلی نے ہی کیوں نہ لکھا ہو۔ تو میری تو شامت ہی آ جائے ـــــ دادا جان یہ کبھی پسند نہیں کرتے۔ کہ میں کسی سہیلی سے ملوں۔ یا خط و کتابت کروں۔ اور پھر ہمسائے بھی تو طرح طرح

کی باتیں کرتے ہیں۔

ہمارے گھروں میں یہ کیسی بُری عادتیں ہیں۔ لیکن ان کو کیسے دُور کروں! ـــــ یہاں تو دور دور تک جاہل لوگ رہتے ہیں۔ ذرہ ذرہ سی بات پر لڑتے ہیں۔ کل شمیم کی والدہ اور شمیم کی دادی میں اپنی بہو اور ساس میں جھگڑا جو شروع ہوا۔ تو اس جھگڑے کے شعلے تین اور گھروں تک بھی جا پہنچے۔ اور پھر باقاعدہ ایک لڑائی شروع ہو گئی۔

ایک کہے، تجھے تو بات کرتے بھی شرم نہیں آتی۔ تیری بیٹی کونسی کنواری بیاہی گئی تھی۔ حرام کا لڑکا پیدا کر کے ہی سسرال پہنچی تھی۔ پھر بھی تو گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتی۔ اور وہ کہے تیری منوّر بھی ایک نہیں کئی حرام کے بچے پیدا کرے گی۔ روز وہ یار سے ملنے جاتی ہے۔ اچھی طرح تیرا ناک کاٹے گی ـــــ

یا خدا! ـــــ ایسی ایسی فحش باتیں کر رہی تھیں۔ کہ سُنی نہیں جا سکتی تھیں۔

اور ماں یہ سُن کر منوّر کو پیٹ رہی تھی۔ کہ نامراد! نہ تو پیدا ہوتی نہ تیرے یار کا طعنہ مجھے ملتا۔

یہاں تو روزانہ یہی کچھ ہوتا ہے۔ روز جھگڑے ہوتے ہیں، چیختی ہیں چلاتی ہیں۔ رات کو خاوند اور بیٹے گھر آتے ہیں۔ تو رو رو کر اُن کو سناتی ہیں ـــــ پھر اُس نے جس جس کو ڈانٹنا ہوتا ہے۔ ڈانٹتا ہے۔ اور رات گئے تک بڑبڑ ہوتی رہتی ہے۔ صبح کو پھر وہی سلسلہ چلتا ہے

میں ایسی باتیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہتی ہوں۔ کہ یہ دُنیا میں کاہے کے لیے آئی ہیں! دُنیا میں آنے کا اِن کا مقصد کیا ہے؟

یا خدا! تو مجھے اس ماحول سے کب نکالے گا! میرے لئے یہ ماحول اتنا اجنبی کیوں ہے!! کب تک اجنبی رہے گا ـــــ!!

آج میں اختر کو خط لکھوں گی۔ مگر پوسٹ کیسے کروں گی ـــــ!!

اچھا۔ کل انجم کے ساتھ بازار چلوں گی۔ تو راستے میں پوسٹ کروں گی۔ خدا کرے یہ خط اختر کو مل جائے۔ ایڈرس تو اُس

نے ٹھیک ہی دیا ہوگا۔ آج کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر خط لکھوں گی۔ سب سے چھپ کر۔ اور جو کہیں دادا جان کو پتہ چل جائے۔ تو گھر کو آگ ہی لگا دیں۔

میں اختر کو بتاؤں گی۔ کہ میں اُسے کتنا زیادہ یاد نہیں کرتی۔ میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور اُسے کہوں گی۔ کہ تم جلدی جلدی آجاؤ۔

اختر کو تین خط ڈال چکی ہوں۔ آج اختر کو گئے دو مہینے ہو گئے
ہیں۔ ۱۵ ستمبر تک اُس نے آنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ ۲۰ روز باقی
رہ گئے ہیں —— یا خدا! یہ بھی جلدی گزر جائیں۔ تو اچھا ہے۔
اختر نے تصویر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی نہیں دی۔ اچھا۔
دن گزر ہی جائیں گے۔ کسی نہ کسی طرح ؛

اختر کو میں چھ خط لکھ کر ڈال چکی ہوں۔ لیکن یہ نہیں پتہ کہ اسے
ملتے بھی ہیں۔ یا نہیں۔ اب یہ تو اس کے آنے پر پتہ چلے گا۔ اس
کے آنے میں اب کون سے دن رہ گئے ہیں۔ صرف چار دن باقی
رہ گئے ہیں۔
نہ جانے اختر اب کیسا ہو گیا ہوگا! ——— ضرور موٹا ہو گیا
ہوگا!
ہم تو اس بڑی گرمی میں کس مشکل سے دن گزارتے رہے
ہیں۔ اس دفعہ تو برسات بھی نہیں ہوئی۔ گرمیوں کا یہ موسم کتنا برا

موسم ہے۔ کل رات کس قدر آندھی آئی تھی! دنیا میں سب سے زیادہ اگر مجھے کوئی چیز بُری لگتی ہے۔ تو وہ صرف آندھی ہی ہے آندھی چل رہی ہو۔ تو کوٹھوں پر سے چیزیں اتارتے ہوئے لوگ بھوت لگتے ہیں۔ آندھی ہر چیز کو خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے کہتے ہیں جس چیز سے اِنسان کو نفرت ہو۔ اکثر وہی چیز اُس کا مقدر بن جاتی ہے ۔ آندھی سے مجھے نفرت ہے ۔۔۔۔۔

کہیں میری زندگی میں بھی کوئی ایسی آندھی نہ چل جائے۔ جو میری زندگی، میری آرزوؤں اور میری جوانی کو خاک میں ملا کر رکھ دے!

یا خدا! ایسا کبھی نہ کرنا کبھی نہ کرنا ؏

کئی روز سے ڈائری نہیں لکھ سکی۔ بہت بخار آتا رہا ــــ رات کو سردی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ آسمان سے ساری رات شبنم گرتی رہتی ہے۔ اور میں معمولی سی چادر اوڑھ کر سوتی رہی ہوں۔ جس سے سردی لگ کر بخار ہو گیا ہے۔

اختر ابھی تک کوہ مری سے نہیں آیا ــــــ اکتوبر کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ خدا جانے اب وہ واپس بھی آئے گا یا نہیں۔

دادا جان نے کالج داخل نہیں ہونے دیا ــــ سارا سارا وقت روتی رہتی ہوں۔ زندگی میں کیا دلچسپی رہ گئی ہے۔ لیکن دلچسپی

پیدا ہی کب ہوئی تھی ؟ دلچسپی کے بغیر زندگی نہیں گزر سکتی۔ ہماری زندگی تو ایک ویران اور کالی رات ہے۔ جس میں چند لمحے کو جگنو جگمگائے تھے۔ اور خدا جانے رات کی اسی تاریکی میں وہ کہاں کھو گئے ہیں۔ کن آسمانوں کی سمت اڑ گئے ہیں ؟

میری ساری سہیلیاں کالج داخل ہو گئی ہیں۔ زندگی اُن کیلئے ایک ایسا پھول ہے۔ جسے بہار اپنے دامن میں پروان چڑھا رہی ہے۔ مگر میرے لئے زندگی ایک ویران باغ ہے۔ ہر درخت پتوں سے خالی ہے ——— شاید کبھی یہاں بھی بہار آجائے ——— !

آج وہ لوگ شادی کا رشتہ لے کر ہمارے گھر آئے تھے۔
وہی لوگ۔ جہاں پر دادا جان شادی کرنا چاہتے ہیں۔ دادا جان
نے کہا ہے۔ میں ایک ماہ کے بعد بتاؤں گا۔ کہ میں زاہدہ کی
شادی کروں گا — یا نہیں —

اُن عورتوں نے مجھے بھی دیکھا۔ اُن کا خیال ہوگا۔ شاید میں
شرماؤں گی۔ اور مسکراؤں گی۔ اور گھونگھٹ نکال نکال لوں گی۔
لیکن میں خاموش۔ اداس اور زرد چہرہ لیئے انکے سامنے
چپ چاپ بیٹھی رہی — میں ان کو کیا کہتی !!

کتنی موٹی۔ بے ڈھنگی عورتیں آئی تھیں! ــــــ ایک نے اگر کس کر چٹیا کی ہوئی تھی۔ تو دُوسری نے یوں جُوڑا کیا ہوُا تھا۔ جیسے کیلوں سے ٹنگا ہوتا ہے۔ سروں پر بے تحاشا تیل لگایا ہوُا تھا ــــــ ایک نے گلابی شلوار۔ فیروزی قمیص اور کیسری دوپٹہ لیا ہوُا تھا۔ دوسری نے مونگیا رنگ کا سوٹ اور سُرخ رنگ کا دوپٹہ ــــــ

واہ واہ کیا میچ کیا ہوُا تھا! سبحان اللہ ــــــ جن کو رنگوں کا سینس نہیں۔ اُن کے دماغ میں تو گھاس بھی نہیں کیا بھرا ہو گا ــــــ

کیا میں ان لوگوں کے درمیان رہ سکتی ہوں! ــــــ نہیں نہیں۔ کبھی نہیں ہوسکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ میں زہر کھالوں گی۔ خودکشی کر لوں گی۔ مگر یہ شادی نہ کروں گی۔

اُن کے جانے کے بعد میں نے امّی سے کہا ــــــ امّی! یہ کس چڑیا گھر سے جانور آئے تھے!! ــــــ کس میلے میں گھومنے گئے تھے!! ــــــ

امّی! ان کو کہنا ــــــ یہاں پھر کبھی نہ آئیں۔ اور امّی ہنس دیں۔ کہنے لگیں! تُو تو یونہی مذاق کیا کرتی ہے! تو پڑھ لکھ گئی ہے

مگر ان کو تو کہیں اسکول میں نہیں پڑھایا گیا نا ——— یہ بچاری سیدھی سادھی ہیں ———

تو امیّ! اِن سیدھی سادھیوں کو پھر سیدھے سادھے گھر میں جانا چاہیئے۔ اتنے میں دادا جان آ گئے۔ اور میں خاموش ہو گئی ٭

آج کا دن میری زندگی میں خوبصورت ترین دن طلوع ہوا تھا
آج کی صبح کتنی حسین تھی! آج کی صبح نے اِس اہتمام سے آسمان
کے مشرقی کناروں سے اپنا چہرہ اُدھر اُٹھایا۔ کہ یوں لگتا تھا جیسے
ایک نہیں دو سورج طلوع ہوئے ہیں۔ آج اختر کوہ مری سے واپس
آگیا تھا۔ اور آتے ہی اُس نے کہلا بھیجا تھا۔ کہ جس طرح بھی۔ تم ابھی
ملنے آؤ۔ میں تمہارے بغیر بہت اداس ہوں۔ آج میں کتنی خوش
تھی!——

میرے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔

کاش! آج کا دن ہمیشہ میری زندگی پر چھایا رہتا۔ آج کے دن کی شام کبھی نہ ہوتی۔

آج کا دن اِتنی جلدی کیوں غروب ہو گیا! ——

ہائے! جب آج میں اختر سے ملی۔ تو میرے لئے وہ لمحہ کس قدر سہاؤنا —— کیسا لافانی، اور کیسا انمول لمحہ نہ تھا! ——

اے زندگی کے حسین ترین لمحے! تو کب سے میری انتظار میں بیٹھا تھا! —— کیا تُو مجھے بار بار نہیں مِلے گا؟

اختر کس قدر موٹا اور سُرخ ہو رہا تھا ..... —— اُس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ نشیلی ہو گئی ہیں —— جب وہ میری طرف پیار سے دیکھتا ہے۔ تو میری دنیا ڈولنے لگتی ہے۔

مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہنے لگا۔ منتیں کیا ہو گیا ہے! تم اتنی کمزور اور زرد سی نظر آ رہی ہو۔ میں نے یہ سُن کر رونا شروع کر دیا میں اُسے کیا کہتی!! ——

مَیں اُسے کیسے بتاتی —— کہ تیری جدائی نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ یہ صرف تیری ہی جدائی ہو گی۔ جو مجھے موت سے ہم آغوش

کرے گی۔ اور تیرا ہی ملاپ ہوگا۔ جو مجھے زندگی بخشے گا۔

پھر میں اور اختر بہت باتیں کرتے رہے۔ اختر اپنی سیر کے واقعات سناتا رہا ـــــ

کہنے لگا۔ وہاں مال روڈ پر شام کو اس قدر رونق ہوتی ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔

اس دفعہ کوہ مری اتنی خوبصورت خوبصورت لڑکیوں سے بھری ہوئی تھی۔ کہ میں بتا نہیں سکتا ـــــ

اس کی یہ بات سن کر نہ جانے کیوں میرا دل اداس ہوگیا ـــــ اختر کو کسی اور لڑکی کا ذکر کرنے یا اسے خوبصورت کہنے کا کیا حق حاصل ہے ؟ مگر میں خاموش رہی!

پھر وہ کہنے لگا۔ ایک لڑکی زرینہ روزانہ مجھے وہاں مال روڈ پر سیر کرتی مل جاتی تھی۔ اور پھر وہ مجھ سے باتیں بھی کرنے لگی۔ ہمارے گھر بھی آنے جانے لگی ـــــ

مگر میں نے اس کی کبھی پرواہ نہ کی۔ میں تو صرف تمہیں یاد کرتا رہا۔ صرف تمہیں۔ کہ اگر تم بھی یہاں ہوتیں۔ میرے ساتھ پہاڑ پر

آئی ہوتیں۔ تو ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سیر کرتے۔ پھر کتنا مزہ نہ آتا!

اور میرا دل جو زرینہ کی بات سُن کر بُجھ رہا تھا۔ پھر سے چمک اُٹھا۔ اور میں بہت خوش ہو گئی۔ اختر پہ مجھے پورا یقین ہو گیا —— پورا پورا یقین۔ کہ وہ مجھے بے انتہا چاہتا ہے۔

میں نے اختر سے کہا۔ اگر تم چاہتے۔ تو تم مجھے ساتھ لے جا سکتے تھے۔

وہ کیسے زاہدہ؟

کیا تم نہیں سمجھے؟

اچھا تو پھر نہ سہی!

اچھا۔ تو پھر اگلے سال سہی۔ یہی ترکیب پھر بھی چل سکتی ہے۔

پھر میں نے بھی اختر کو اپنی باتیں بتائیں۔ کہ اُس کے بغیر میری زندگی کے دن کیسے گزرے۔ اُسے بتاتے وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اختر کہنے لگا۔

تم بالکل بچہ ہو۔ ذرہ ذرہ سی بات پر رونے لگ جاتی ہو!

پھر اختر نے پوچھا۔ کالج داخل ہو گئی ہو؟

مَیں نے کہا۔ بالکل نہیں ہوئی۔ نہ ہو سکتی ہوں۔ دادا جان تو اگلے ماہ میری شادی کر رہے ہیں ——

اختر نے بڑے افسوس کا اظہار کیا۔ مگر وعدہ کیا۔ کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور مدد کیے گا۔ اُس نے بتایا۔ کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور یہ کہہ کر اُس نے مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اُس کے سینے کے ساتھ لگتے ہی مَیں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور مجھے یوں لگا جیسے مَیں جادو کی مدد سے جنّت میں داخل ہو گئی۔ اُس کے چوڑے سینے پر سر رکھ کر میں زندگی بھر تک سوئی رہنا چاہتی تھی۔

اس کے گریبان کے پاس سے بہت اعلیٰ سینٹ کی خوشبو آ رہی تھی۔ پھر اختر مجھے بہت پیار کرتا رہا ——

لیکن بار بار ایک خیال آتا تھا۔ کہ جہاں جدائی نے مجھے اُداس اور زرد کر دیا تھا۔ وہاں اختر کو جُدائی نے کتنا سُرخ اور موٹا کر دیا تھا! ——

کیا اختر کو جدائی راس آ گئی تھی! —— مگر نہیں نہیں

مجھے ایسے شک اور وہم کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیے۔ یہ وہم اور شک محبت کو قتل کر دیتے ہیں ——

مَیں نے شروع دن سے ہی اُس کی بات پر یقین کر لیا تھا۔ اور ہمیشہ اس کی باتوں پر ایمان لاؤں گی۔ وہ کبھی جھوٹا اختر ثابت نہیں ہو گا۔

گھر آتے ہی دادا جان سے جھڑکیاں پڑیں۔ مگر آج اُن کی جھڑکیوں کی کون پرواہ کرتا تھا!

آج میری پرانی اور پیاری سہیلی نجمہ نے مجھے خط بھیجا۔ نجمہ کتنی مہربان اور اچھی لڑکی ہے! اور خط کے ساتھ اُس نے مجھے ایک جوڑا بھی بھیجا ہے۔ میں لینا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اُس نے کتنے پیار اور اصرار سے بھیجا تھا! —— جوڑا کتنا پیارا ہے! امّی کہتی ہے جہیز کے لئے رہنے دو۔ مگر میں تو اسے پہن لوں گی۔

میں اسے پہن کر اختر کے پاس جاؤں گی —— آسیہ کراچی سے آئی ہی نہیں۔ بلکہ وہاں سے کوئٹہ چلی گئی تھی۔ اور اب وہ اسکول بھی نہیں آئے گی۔ لیکن مجھے اب اسکول سے کیا!

لیکن آج دادا جان سے کہوں گی۔ رات رو رو کر اُن کو مناؤں گی۔
کہ مجھے کالج میں داخل کرا دیں۔ اختر نے تو کوئی بھی نہیں کہلا بھیجا۔
وہ بیچارا کہے بھی کیسے؟ دادا جان تو ایک پل میں عزت اتار
کر رکھ دیتے ہیں۔

پھر کیا ہوا۔ اگر اختر نے وعدہ کرنے کے باوجود کسی کو نہیں بھیجا
میں اُس سے اِس بات پر کبھی خفا نہیں ہوں گی۔ اختر جو کچھ بھی ہے
اچھا ہے یا بُرا۔ اب تو وہ میرے دل کی خوشی میری زندگی کا خون
اور میرے سر کا تاج ہے۔ اگر وہ مجھ سے پیار کرتا ہے تو پھر میرے
لئے یہ سارا کچھ ہے۔ اور وہ یقیناً مجھ سے پیار کرتا ہے۔

ایک ماہ گزر گیا ہے۔ دادا جان نے میری وہاں بات پکی کر دی ہے۔ اور کہا ہے۔ کہ شادی بھی جلدی کر دیں گے۔

ہائے! میں کیا کروں گی۔ میں نے تین روز سے روٹی بھی نہیں کھائی۔ بھوک ہڑتال شروع کی ہوئی ہے۔ رو رو کر پاگل ہو رہی ہوں مگر میری بات کوئی نہیں مانتا۔ امّی بھی خاموش ہیں۔ امی کو کیا پتہ کہ یہ شادی نہیں۔ بلکہ اُس کی بیٹی کی موت ہوگی۔ دادا جان بھی نہیں سُن رہے۔

وہ تو بالکل ہی پاگل ہو گئے ہیں —— کیا اُنھوں نے اپنی شادی

کرنی ہے۔ یا خدا! میری مدد کرنا۔ میں تو نہ راتوں کو سو سکی ہوں۔
نہ کچھ کھایا ہے۔

ہائے! میں کیا کروں گی! ——

اختر کو بھی کچھ خیال نہیں ہے!

میں ایک دو روز تک اختر کو جا کر ضرور کہوں گی ضرور کہونگی۔
کہ کیا وہ میرے ساتھ فریب تو نہیں کر رہا! میرے دل
میں شک آ رہے ہیں ——

لیکن نہیں۔ جب تک اُس کو دیکھ نہ لوں گی شک کو پاس
نہیں آنے دوں گی۔ میں اُس سے آخری بات پوچھ کر آؤں گی۔
ہائے! مجھے بار بار شادی کا کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہے
مگر اختر کو کوئی خیال نہیں ہے۔ اچھا۔ میں اب بالکل آخری دفعہ
اختر سے کہوں گی۔ کہ اگر اب اُس نے اپنی کوشش نہ کی۔
تو پھر میں اُس سے ملنے کبھی نہ آ سکوں گی۔

پھر میری زندگی کے سارے گیت ختم ہو جائیں گے۔

ہر آواز خاموش ہو جائے گی ——

میرے آسمان پر سے ہر تارا ٹوٹ کر کہیں گم ہو جائے گا ——
اور سارا آسمان تاریک ہو جائے گا۔ میری دُنیا
اندھیری ہو جائے گی۔ نہ کوئی سورج چمکے گا —— اور
نہ کوئی چاند مسکرائے گا ——

میں اُسے سارا کچھ بتا دوں گی —— ضرور بتا دوں گی ؛

———

آہ! ابھی اِس بہار کا پہلا پھُول بھی نہیں کھلا تھا۔ اور ابھی کسی بلبل نے بھی ٹہنیوں پر بیٹھ کر کوئی بھی رسیلا گیت نہیں گایا تھا۔ کہ خزاں کی زرد آندھی چھا گئی۔!

کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ کیا ہو گیا ہے! میرے کس دشمن نے میری شکایت لگا دی ہے؟

آہ! دادا جان اور امی کو کسی نے آن کر میری اور اختر کی دوستی کی تمام باتیں بتا دی ہیں۔ اور مَیں نے جو خط اختر کو لکھے تھے۔ اُس کا بھی بتا دیا ہے۔ آہ! ایسا میرا کون دشمن تھا! ——

میں نے اُس کا کیا بگاڑا تھا۔! ——

امی نے مجھے کچھ نہیں کہا ہے۔ بالکل کچھ نہیں۔ مگر ان کے آنسو نہیں تھمتے۔ مَیں اُن کو بہتیرا یقین دلاتی ہوں۔ کہ امّی! یہ سارا کچھ جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ ہے۔

اور انہوں نے مان بھی لیا ہے کہ یہ سارا کچھ جھوٹ ہی ہو گا مگر وہ میری قسمت پر رو رہی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں وہ رو رہی ہیں۔

اور دادا جان نے تو مجھے اتنا مارا ہے۔ اور گالیاں دی ہیں۔ کہ بتا نہیں سکتی۔ دو روز سے گھر میں کچھ پکا ہے۔ دادا جان کہتے ہیں۔ اس کی ڈولی یا جنازہ گھر سے نکال کر ہی اب یہاں چولھا گرم کروں گا —— میرے خدا! یہ کیا ہو گیا ہے! مگر یہ بتایا کس نے ہے!

کیا اختر کے گھر والوں میں سے کسی نے بتایا ہے! لیکن اور کون بتا سکتا ہے! اور تو کسی کو علم نہیں! مجھے جس بات کا ڈر تھا۔ وہ ہو گیا ہے۔

اب کیا ہو گیا!!

اختر! کیا تمہارے گھر والے اس قدر بے رحم اور ظالم ہیں! میں
نے ان کا کیا بگاڑا تھا! —— اختر! میں نے تو تم سے کبھی کچھ
نہیں چاہا تھا —— تم سے صرف محبّت ہی کی تھی نا ——
اس ایک سال کے عرصہ میں صرف تم سے محبت ہی کی ہے
نا —— اور تو تم سے کچھ نہیں چاہا۔ میں نے تم سے کچھ لیا تو نہیں
نا —— بلکہ دیا ہی چاہا ہے نا۔ پھر ایسا کیوں ہو گیا!
کیا تم نہیں جانتے تھے۔ کہ ہم لڑکیاں —— ہم جیسے
ماحول کی لڑکیاں —— کسی سے یوں محبت نہیں کر سکتیں۔ وہ اگر
کسی لڑکے سے محبت کرتی ہیں۔ تو اُس کو اپنا خاوند سمجھ کر کرتی ہیں۔
ہم محبت کہیں اور شادی کہیں اور نہیں کر سکتیں۔
نہ ہم محض دوستی رکھ سکتی ہیں —— پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے
کہ میں کہیں اور شادی کر لوں۔
میرا تو اب کسی اور شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کو جی
نہیں چاہتا۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔
اختر بولو نا۔ میں کیا کروں گی! مَیں تمہیں کیسے بھلا دوں! ——

تمہیں بھلانا میرے اختیار سے باہر ہے۔

میں اب تو تمہیں مل بھی نہیں سکتی۔ ورنہ میں تمہیں سارا کچھ بتاتی۔

کاش! میری مہربان سہیلی نجمہ یہاں ہوتی۔ تو میں اُسے سارا کچھ بتاتی۔

مگر وہ تو اتنی دُور سیلون بیٹھی ہے۔

اب کیا ہوگا! سوچ سوچ کر میرا تو سر بھی پھٹنے لگا ہے!

زندگی دکھوں اور غموں سے بھری ہوئی ایک ایسی طویل اور
سیاہ رات نظر آتی ہے۔ جس کی صبح قیامت تک بھی ہوتی نظر نہیں
آتی ——

اِس زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا۔ جو خوشی کا ہو ——
بیوفا اختر! دو ماہ ہو گئے ہیں۔ اُس سے ملے ہوئے۔ مگر اُس نے
کوئی بھی خط نہیں لکھا —— مجھے کبھی خیال نہیں آیا تھا۔ کہ اختر
ایسا بھی بے وفا ہو سکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اُس کی باتوں پر یقین کیا
تھا۔ وہ جھوٹا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن کیا پتہ۔ یہ اُس ہی کی شرارت نہ ہو

وہ تو کہتا تھا میں تم سے محبت کرتا ہوں ——— پھر وہ شرارت کیسے کرسکتا تھا! ———

کل شام داداجان گجرات جارہے ہیں ——— ان کے جانے کے بعد میں ایک بار تو خود بھی اختر سے ملوں گی۔ضرور ملوں گی۔

پھر اس کے بعد جو ہوگا۔دیکھا جائے گا۔زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا۔کہ میں خودکشی کرلوں گی۔میں نیلا تھوتھا کھالوں گی۔اور مرجاؤں گی مجھ کو بھلا زندہ رہ کر کیا کرنا ہے۔!

لیکن میری بہن اور میرے بھائی اور میری ماں کا کیا بنے گا! میری ماں تو یہ صدمہ کبھی نہ سہہ سکے گی؟! زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔چند ماہ تک میری شادی ہوجائے گی ——— ہائے! میں شادی کیسے کرسکتی ہوں! مجھے اُن لوگوں سے نفرت ہے جہاں یہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔

میں اختر کے سوا کسی سے شادی نہیں کرسکتی۔لیکن اگر میری شادی اختر سے نہیں ہوسکتی۔تو پھر میں کسی سے بھی نہیں کروں گی۔

پھر میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گی۔لیکن یا خدا! اِس داداجان کو تو ہی سمجھا۔میں کس کے آگے فریاد کروں!!

کل سے بارش ہو رہی ہے۔ سردیوں کی ٹھنڈی اور تیز بارش!
دادا جان کو گجرات جانا تھا۔ مگر نہیں گئے۔ اب بارش تھمے گی۔ تو
پھر جائیں گے۔ ایک ایک لمحہ گِن گِن کر گزار رہی ہوں ——
یوں لگتا ہے —— جیسے یونہی جلتے جلتے مر جاؤں گی۔ بس
ایک بار اختر سے ملنے اور مل کر ساری باتیں کرنے کی حسرت ہے۔ وہ
پوری ہو لے۔ تو پھر مر جاؤں گی۔ مجھ کو زندہ رہ کر کیا کرنا ہے! ⁂

رات دادا جان گجرات چلے گئے ہیں۔ آج میں اختر سے ملنے گئی۔ اُن کے گھر میں کافی چہل پہل نظر آتی تھی۔ مہمان وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے واپس آنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر پھر سوچا۔ کہ شاید پھر نہ آسکوں آج ہی بات کر کے جاؤں۔

اختر کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر جا کر بیٹھ گئی۔ اور کمرہ کو دیکھنے لگی۔ مجھے پچھلے سارے دن یاد آ گئے۔ اور سارے دنوں کے ساتھ ہی آنکھوں میں بے شمار آنسو آ گئے۔ اتنے آنسو۔ جو بہے بغیر نہ رہ سکے۔ میرا دل بھر آیا۔ اور میں نے سسکیاں بھر بھر کر رونا شروع کر دیا۔

پھر ایک دم خیال آیا۔ کہ اگر کوئی اور آگیا۔ تو! اور میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ کہ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کہ میں خواہ مخواہ پاگل ہو رہی ہوں۔

اتنے میں اختر آگیا —— مجھے دیکھ کر بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا —— اُس کے پٹنے کی دیر تھی۔ کہ آنسوؤں کا سیلاب سارے بند توڑ کر بہہ نکلا —— اور پھر میں اس قدر روئی۔ کہ اس کی قمیض گریبان کے پاس سے تر ہو گئی۔ اور وہ خاموش رہا!

باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تو وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور میں بھی درست ہو کر بیٹھ گئی۔ آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ میں نے رومال سے خشک کر کے منہ پرلی طرف دیوار کو کر لیا۔ لیکن کوئی بھی اِدھر نہ آیا۔ بلکہ سیدھا اوپر چڑھ گیا۔ اختر نے اُٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ اور پھر پاس کی کرسی پر آن بیٹھا!

زاہدہ! کیا مجھ سے خفا ہو۔

میں خاموش رہی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ میں بات کیسے شروع کروں۔

میں پھر بھی خاموش رہی۔

کیا مجھ سے بولو گی نہیں۔

میں پھر بھی چپ رہی۔

پھر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جھنجھوڑا۔

زاہدہ! زاہدہ! کچھ تو بات کرو نا۔ دیکھو تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے!

میں چپ تھی۔

زاہدہ! تمہیں میری جان کی قسم۔ کچھ تو بات کرو۔

مگر مجھ سے بات ہی نہیں ہو تی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے کسی نے مجھ سے قوتِ گویائی ہی چھین لی ہے۔ ہونٹ کھولنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

پھر وہ اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ اور میرے ہونٹوں پہ اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اور کہا:۔

تمہیں اب کوئی حق حاصل نہیں۔ کہ تم مجھے یوں پیار کرو۔

کیوں ؟

یہ اپنے دل سے پوچھو۔ یا اُن لوگوں سے پوچھو جنہوں نے میرے گھر میں چغلیاں لگائی تھیں۔ اختر! —— تم مجھے یوں بھی کہہ سکتے تھے۔ کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ مگر تمہیں ایسا رویہ کبھی اختیار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

تم نے میرا جینا اجیرن کر دیا ہے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ تمہارے کارن ہمارے گھر میں جو کچھ ہوا ہے۔ وہ تمہیں میں کبھی نہ بتا سکوں گی۔ نہ تمہیں اس کا احساس ہو سکتا ہے ہماری زندگی تو پہلے ہی دکھوں سے بھری ہوئی تھی اختر! پھر تم لوگوں نے ایسا ظلم کیوں کیا اختر!

مگر اختر نے قسم کھالی۔ کہ اُسے اس واقعے کا کچھ علم نہیں ہے نہ اُس کے گھر والے ایسے ہو سکتے ہیں۔

لیکن میرے دل کو یقین نہ آیا۔ بھلا اُن لوگوں کے سوا اور کسی کو کیا علم تھا۔

لیکن میں چپ ہو گئی۔

کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اختر نے بتایا۔ کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اور واقعی محبّت کرتا ہے۔ لیکن شادی کرنا اس کے متعلق وہ اب کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اُس نے گھر میں بہت زور لگایا تھا۔ مگر اُس کی امی کسی طرح نہیں مان رہی۔ وہ اپنی بھتیجی تمکینہ کے ساتھ میری شادی کرنا چاہتی ہے۔

اختر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا ــــــ

موت کا سا سناٹا چھا گیا ــــــ

مجھے اختر کے اِس جواب کی ہرگز ہرگز توقع نہ تھی۔ میرا دل اتنی شدت سے دھڑکا۔ جیسے ابھی رُک جائے گا۔

پھر کچھ دیر تک میں وہاں بیٹھی رہی۔ اور پھر اُٹھ کر آنے لگی۔ اختر نے واسطے دے دے کر کہا۔ کہ خدا کے لئے حوصلے اور صبر سے کام لینا۔ اور ملنے ضرور آیا کرنا۔ میں مجبور ہو گیا ہوں۔ وعدہ کرو ملنے آؤ گی!

دیکھو ــــ غم نہ کھانا۔

خدا کو اِسی طرح منظور تھا۔ مجھ سے اِس سے

کچھ نہ سُنا گیا ـــــــ مجھے اپنے چاروں طرف آندھیاں چلتی نظر آئیں ۔ اور میں نہ جانے کس مشکل سے راستے میں چل کر گھر آئی ۔ اور پھر سیڑھیوں میں ہی چکّر کھا کر جو گری ۔ تو بعد کی ہوش نہ رہی ؂

آج کئی روز کے بعد ہوش آئی ہے۔ سارا جسم درد سے چُور چور ہو گیا ہے۔ سیڑھیوں پر جب گری تھی۔ تو نیچے پانی بھرنے کا گھڑا پڑا ہوُا تھا۔ اُس کے ساتھ جا کر ٹکرائی ــــــ ماتھا اور آنکھ کے قریب سے جگہ پھٹ گئی۔ کانوں سے خُون بہنے لگا۔ بازو کے قریب شدید چوٹیں آئیں۔ بہت بُرا حال ہوُا۔

امّی سارا وقت روتی رہتی ہیں ــــــــ سوچنے اور سمجھنے کی ہر قوّت جیسے جواب دے گئی ہے ؛

ـــــــــــ

کئی روز کے بعد آج بستر سے نیچے اُتری۔ آئینہ میں چہرہ دیکھا۔ تو ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ آج میں نے اپنا بستر اوپر دھوپ میں لگوایا۔ اور دیوار سے ٹیک لگا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

آسمان گہرا نیلا ہو رہا تھا۔ اور بڑی ہی پیاری اور سنہری دھوپ چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ دن بڑا ہی روشن تھا۔

یہ سماں دیکھ کر نہ جانے کیا خیال جی میں آیا۔ کہ سارا جسم لرز اٹھا۔ اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ آنسو یوں نامعلوم آوازیں گرتے رہے۔ کہ پوچھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی ——

ایک دم دل میں خیال آ گیا ——

میں کیا تھی؟ میں نے کہاں سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اور میں کہاں آ گئی ہوں! —— میری سہیلیاں ہنسی خوشی کالج جاتی ہوں گی۔ اختر بھی بہت خوش خوش زندگی گذار رہا ہو گا۔ اُس کو مجھ سے کیا۔؟

اُس نے تو محض کھیل کھیلا تھا ——

کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔ اگر زندگی تباہ ہوئی ہے۔ تو صرف میری ——

ماں جانتی ہے۔ کہ مجھے کوئی روگ اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔ اور اس خیال سے اُن کی جان بھی گھُل رہی ہے۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ دادا جان میری شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ لوگ میری عیادت کو آئے تھے۔

نیچے پھوپھی نے نہ جانے ان کو کیا سکھلایا ہے۔ کہ وہ مُنہ پھُلا کر یہاں بیٹھی رہیں۔ اور پھر چلی گئیں۔ اللہ کرے! اب کبھی نہ آئیں! سمجھ میں نہیں آتا۔ زندگی کیسے بسر ہو گی؟ کیا ہو گا؟

نسیمہ میرا کس قدر خیال رکھتی ہے! بچاری ننھے ننھے ہاتھوں سے
میرا سر روز دباتی ہے۔ کہتی ہے۔ باجی! آپ کب اچھی ہوں گی! آپ
کو ایسا بُرا چکر کیسے آ گیا۔ کہ آپ ساری سیڑھیاں ہی گر پڑیں ——
میری بہن نسیمہ! میری چھوٹی سی گڑیا! انہیں کیا پتہ۔ میں کہاں
سے گری ہوں؟
تُو تو صرف سیڑھیوں پر سے کہہ رہی ہے۔ میں تو اپنی زندگی
کی بلند ترین چوٹیوں پہ سے گری ہوں۔ اور ایسی گری ہوں۔ کہ اب کبھی
نہ اُٹھ سکوں گی۔ یہ سیڑھیوں کی چوٹ تو چند روز کے بعد بالکل ٹھیک
ہو جائے گی۔ مگر میرے دل پر جو چوٹ آچکی ہے اور جو زخم لگ گیا
ہے۔ وہ دن بدن پھیلے گا۔ ناسور بنے گا ——
اُس کو کبھی آرام نہ آ سکے گا۔ یہ زخم کبھی مندمل نہ ہو گا۔ یہ تو میری
زندگی کی بنیاد تک کو ہلا کر رکھ دے گا۔
یہ مجھے قبر میں اتار کر دم لے گا۔ یہ نہ جانے اور کس کس کو
اپنی لپیٹ میں لے لے۔ تُو تو ابھی معصوم ہے۔
کبھی میں بھی ایسی ہی معصوم تھی۔ تم جیسی ایک چھوٹی سی پیاری

لڑکی تھی ——— مگر اب! ——— اب تُو نہیں جان سکتی ۔ نہ خدا کرے تو کبھی جانے!

پھوپھی کے لڑکے نے آج چھٹی لی ہوئی ہے ۔ ریڈیو لگا کر کمرہ میں بیٹھا ہؤا ہے۔

ریڈیو پر ریکارڈ لگا ہؤا ہے۔

دل آہ بھر ایسی ——— کہ میری جان جلا دے

خورشید گا رہی ہے۔

اے میرے دل! تُو بھی ایسی آہ بھر۔ کہ میری جان جلا کر راکھ کر دے!

زندگی کا کوئی مقصد سامنے نہیں رہا۔ اور بلا مقصد زندگی بسر کرنا کس قدر کٹھن اور مشکل کام ہے۔

سارا سارا دن اوپر چھت پر دھوپ میں لیٹی رہتی ہوں۔ چہرے کا رنگ سیاہی مائل ہو رہا ہے۔ کبھی آسمان کو تکتی رہتی ہوں۔ اور کبھی دیوار سے اکھڑی ہوئی پلستر کو گھورتی رہتی ہوں۔

کاش! میں کالج داخل ہو جاتی —— تو میرا جی کس قدر رنگ جاتا —— کچھ تو لگ جاتا —— سہیلیوں میں اور پڑھائی میں محو ہو کر میں اختر کے بخشے ہوئے غم کو بھول جاتی۔ مگر اب کیا کروں! سارا

وقت صرف اُسی کا خیال دل میں سمایا رہتا ہے۔ اور مجھے رُلاتا رہتا ہے۔

اختر نے مجھے کئی بار بُلا بھیجا ہے۔ مگر میں نہیں گئی۔ میں نے اب کیا جا کر کرنا ہے! —— جس طرح بھی ہوُا۔ میں اپنا جی لگاؤنگی میں اُسے بتاؤں گی۔ کہ اگر تم مجھے آسانی سے بھلا بیٹھے ہو۔ تو میں بھی نہیں بھُلا سکتی ہوں ——

مَیں کبھی اختر کو ملنے نہ جاؤں گی ::

وہ جو میرا رشتہ لے کر آیا کرتی تھیں۔ ان کو پھوپھی نے جل کر نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہے۔ کہ انہوں نے کہلا بھیجا ہے ہم نے کہیں اور منگنی کر لی ہے۔

اس خبر نے جہاں دادا جان کو دکھ پہنچایا ہے۔ وہاں مجھے بے اندازہ خوشی بخشی ہے۔ پھوپھی اب اپنے لڑکے کو پیش کرنا چاہتی ہیں مگر میں بھلا کبھی اس سے شادی کر سکتی ہوں! کبھی نہیں کرونگی میری زندگی تو پہلے ہی تلخ ہو چکی ہے۔ اب اور مزید کیا تلخ ہو گی!

چار مہینے گزر گئے ہیں میں نے گھر پر ایف۔ اے کی کتابیں منگا کر پڑھائی شروع کر دی ہے۔ سعیدہ میری سہیلی کالج کے بعد روزانہ یہاں آجاتی ہے۔ اور پھر ہم دونوں مل کر کام کرتی ہیں۔

اختر کا خیال کسی لمحے نہیں بھولتا۔ میں اپنے آپ کو ہر لمحہ مصروف رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ تاکہ اسے بھول جاؤں ــــ سعیدہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ کہ تم کتنی کمزور ہو گئی ہو۔

اختر کو دیکھے چھ ماہ گزر گئے ہیں ——

پتہ نہیں وہ کس حال میں ہے !!

لیکن میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ خواہ مخواہ سوچ لیتی ہوں۔ جیسے

شاید وہ بھی میرے بغیر اداس ہوگا ——

لیکن اُس نے بھلا کاہے کے لئے اداس ہونا ہے!

وہ اچھا بھلا ہوگا!

اے دل اب اُسے بھول جا۔ ہمیشہ کے لئے بھول جا۔ ؞

———

پھوپھی اِس گھر سے چلی گئی ہے۔ مگر چونکہ دادا جان نے اُس کے لڑکے سے رشتہ نہیں کیا۔ اِس لیے جاتے ہوئے دادا جان کو کہہ گئی ہے۔ دیکھ لینا! تیری بیٹی کو سارے خاندان اور ساری برادری میں لشتر کر کے چھوڑوں گی۔ اُسے اِس قابل نہیں رکھوں گی۔ کہ کہیں اور شادی ہو سکے۔ پھر تو خود ہی میری منّتیں کرے گا۔ اور یوں تجھے اپنے قدموں پر پڑا ہوا دیکھوں گی۔

کتنی ذلیل عورت ہے۔ اِس کا یہاں آنا بدنصیبی کے آنے سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ جب سے یہاں آئی تھی۔ ہزاروں طرح کی

لڑائیاں کرواتی رہی تھی۔ اور اب جاتے جاتے بھی دھمکی دے گئی ہے۔

یہ نیکی کا زمانہ ہے ہی نہیں۔ رہنے کو جگہ دے دی۔ اور انعام یہ دے گئی ہے۔

اور اُس نے تو ابھی نکلنا بھی نہیں تھا۔ دادا جان نے خود ہی اسے رخصت کیا ہے۔

اس کا زندہ بیٹا انجم کو بُری بُری حرکتیں سکھا رہا تھا ـــــ اور ہمیں علم ہی نہیں تھا ـــــ

کل جب انجم روتا ہوا میرے پاس آیا۔ کہ وہ جو نیچے آدمی رہتا ہے نا! پھوپھی کے ساتھ؟ ـــــ وہ مجھے اندر کوٹھڑی میں لے گیا تھا اور پھر ـــــ پھر اُس نے ایک ایسی بُری بات بتائی۔ کہ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ یہ بھلا کون ہو میرے بھائی کو خراب کرنے والا!

میں نے اُسی وقت دادا جان اور والدہ کو بتایا۔ اور دادا جان نے دوسرے ہی دن پھوپھی کو نوٹس دے دیا۔ کہ یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو ـــــ

جہاں جی چاہے بیٹے کی شادی کرو ـــــ

اِس بات پر بہت جھگڑا ہوُا۔ اور نامراد عورت پھوپھی نے میرے وہ وہ طعنے دادا جان کو دئے۔ کہ ہمسائیاں توبہ توبہ کرنے لگیں۔

دادا جان سارے گھر میں گالیاں دیتے پھرتے تھے۔ اور میں اور والدہ سہمی ہوئی تھیں۔

اُس وقت میرا جی کس طرح رو رہا تھا! —— جس شخص کے لیے بدنام ہوئی۔ جس شخص کے لئے زندگی کو روگ لگایا۔ وہ پھر بھی اپنا نہ ہوُا۔ اور یہی وہ نازک اور دردناک وقت ہوتا ہے۔ جب محبّت پھوٹ کر روتی ہے۔

میں اُس لمحے کس قدر ویران نہیں ہوگئی تھی —— میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی ——

اگرچہ آدھی ہمسائیوں نے یقین کیا تھا۔ اور آدھی ہمسائیوں نے یقین نہیں کیا تھا۔ اُن کو معلوم تھا۔ کہ میں کیسی لڑکی ہوں۔ کبھی کوٹھے پر جاکر یا کھڑکیوں میں کھڑے ہوکر تانک جھانک نہیں کی تھی۔

مگر پھر بھی یہ عورت میرا زخمی دل تو دکھا گئی نا! ——

دادا جان کے دل میں تو بُرائی ڈال گئی نا! ——

وہ پُرانی وضع کے جاہل قسم کے آدمی ہیں۔ ایک پل میں گالیاں دینے پر اُتر آتے ہیں۔

رات کو دادا جان آئے۔ تو میں اُن کے سامنے ہی نہ ہوئی۔ ایک دو روز تک اُن کا غصّہ اُتر جائے گا۔ میں ان کو سمجھا لوں گی ـــ

دادا جان کو بات سمجھا دی جائے۔ تو سمجھ جاتے ہیں ـــ

لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔ کہ وہ نامراد تو یہاں سے چل دی نا ـــ

ایسی عورتوں سے خدا بچائے۔ یہ تو شیطان کو بھی آگے لگاتی ہیں ـــ اُف

آج میرا دل بڑا اُداس تھا۔ نہ جانے اختر کیوں بار بار یاد آ رہا تھا۔ اور اُس کے ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ جب آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں۔ تو سارا جسم لرزنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ آنسو نہیں گرتے۔ بلکہ خون نکلتا ہے۔ خُون کے آنسو بہتے ہیں۔

آج جی چاہتا ہے کہ اختر سے ملوں۔ مگر کیسے ملوں؟ اور پھر فائدہ بھی کیا ہے؟ کیا معلوم۔ وہ مجھے بالکل ہی بھُول چکا ہو!—— یقیناً یہی ہو گا —— وہ مجھے بھُول چکا ہو گا!— آہ!——

ایک خط! جو پوسٹ نہ ہو سکا!:۔

اختر! تم سے ملے بغیر یہ دن کچھ یُوں گزر رہے ہیں۔ جیسے
اِن کا میری زندگی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ جیسے رنگین تصویروں
کی کتاب دیکھتے دیکھتے اچانک بیچ میں سادہ اور سفید ورق آ گئے ہوں۔
جیسے سینما دیکھتے دیکھتے ایکا ایکی فلم ٹوٹ گئی ہو۔ آج نہ جانے کیوں
تمہاری ایک ایک بات، تمہارے ساتھ گذارے ہوئے وہ حسین دِن
مجھے بُری طرح یاد آ رہے ہیں۔ جیسے میرے سامنے رنگین تصویروں
والی فلم چل رہی ہو۔ جیسے میں گہرے اندھیروں میں روشنیوں کے خواب

دیکھ رہی ہوں۔ جیسے ڈراؤنے خوابوں کی بجائے میں نے چمکیلے خوابوں
کے ٹکڑے دیکھ لئے ہوں۔

اختر! بیوفا اختر! میں اکثر سوچتی ہوں۔ کہ وہ پھول اب کیوں
نہیں کھلتے۔ جو اُن دنوں کھلا کرتے تھے۔ اور ویسا ہی چمکیلا سورج
اب کیوں طلوع نہیں ہوتا! جو پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں پر نہایت
آب و تاب کے ساتھ چمکا کرتا تھا لیکن اب تو شام کے گہرے سائے ہر
طرف پھیل رہے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اگر وہ قوس و قزح
ہمارے آسمان پر دوبارہ نہیں چھا سکتی۔ تو پھر ان دنوں کی سوگوار یاد
کیوں باقی رہ جاتی ہے!

شام کی اُداسی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اور میں تمہیں یہ خط
لکھ رہی ہوں۔ جو کبھی پوسٹ نہ کر سکوں گی۔ اس لئے نہیں۔ کہ یہ خط
تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ اب ایسے خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا؟
تم مجھے بھول چکے ہو گے۔ نئے چمکیلے رنگ سے ثمینہ نے تمہیں
اپنی طرف کھینچ لیا ہو گا۔ نئے پھول کی خوشبو تمہیں پسند ہو گی تمہارے
دماغ پر چھا چکی ہو گی۔ اور تم مجھے یکسر فراموش کر بیٹھے ہو گے ——

کاش ! تم ایک الھڑ لڑکی کی محبت کو سمجھ سکتے !

میرا یہ انتظار بالکل فضول ہے۔ کہ شاید تم پلٹ آؤ۔ شاید تم واپس آجاؤ۔ اور بہاریں پھر اِس اُجڑے چمن کو ہرا کر دیں۔ اور ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دئے۔ زندگی کے طوفانوں کے اُس پار اُتر جائیں۔

کاش ! بے وفا اختر! تمہیں اِس کا احساس ہو سکتا۔ کہ تم نے وفاداری کو کس بے رحمی سے زہر پلایا ہے۔ تم نے پھُول کی پتّی پتّی نوچ کر فضاؤں میں بکھیر دی ہے۔ مگر تم اتنی دُور جا چکے ہو۔ کہ اب تمہیں پکارنا بالکل فضول ہے۔ محبت کا چشمہ تمہارے دل میں سوکھ چکا ہے۔ اور اِن درختوں پر اب کبھی پھُول نہیں کھلیں گے۔

میری دنیا سے اب بہار رخصت ہو چکی ہے۔ درختوں نے افسردگی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔

محبت کا چاند پہاڑیوں کے عقب میں غروب ہو چکا ہے۔ اب چاندنی محبت کے کبھی گیت نہ گائے گی۔

تم ! ایک بیوفا آدمی ! بہ صرف تمہیں وہ شخص ہو۔ پہلے اور

آخری جس سے میں نے محبت کی ہے۔ اور اس محبت کو دل سے نکال دینا میرے بس سے باہر ہے۔ محبت کا پھول صرف ایک ہی بار کھلتا ہے۔ یہ سورج ایک ہی بار طلوع ہوتا ہے۔

اختر! تم نے اگر یوں چھوڑ دینا تھا۔ تو پھر میری معصوم جوانی کو محبت کے راگوں سے کیوں بھرا تھا! میری زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی۔ تم نے مجھے کیوں بلایا تھا! تم نے کیوں اپنا بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن تم تو یہ ساری باتیں بھول چکے ہو گے۔ تم مرد لوگ سارا کچھ آسانی سے فراموش کر دیتے ہو۔

کاش! میں بھی تمہیں بھلا سکتی!

اختر! ایک لڑکی کی زندگی کو خراب کرنے سے پہلے تمہیں یہ سوچ لینا چاہیئے تھا۔ جن وادیوں کو۔ جن راہوں کو تم طے نہ کر سکتے تھے۔ تم نے وہاں قدم ہی کیوں رکھا!

تم امیر لوگ ہو اختر۔ اور ہم غریب! ——— تمہارے گھر والے یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ کہ تم ایک غریب لڑکی سے شادی کر دو ———

اختر! کاش! میں تمہیں اپنا دل چیر کر دکھا سکتی۔ کہ میرے

دل کے ہر رستے ہوئے زخم پر تمہارا ہی نام کھدا ہوا ہے۔ تمہارے ہی گھاؤ لگے ہوئے ہیں۔ مگر تم اپنی ذرا سی بات کہہ کر میرے چاروں طرف ویرانیاں پھیلا کر چل دیے۔

اور میں یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ کہ مرد کی محبت ایک لمحہ میں بدل سکتی ہے۔

مرد جو کچھ کہتا ہے کبھی اس پر عمل نہیں کرتا۔ مرد کبھی وہ نہیں ہوتا جو اپنے آپ کو ثابت کرتا ہے۔

کاش! تمہیں معلوم ہو سکتا۔ کہ کس شدت کے ساتھ تمہاری پرستش کی جاتی رہی ہے۔

کاش! تمہیں اس کا ذرہ سا بھی احساس ہو جاتا ——

تمہیں معلوم ہو سکتا۔ کہ محبت کتنی زبردست چیز ہے۔ محبت تو ایک ازلی اور ابدی چیز ہے۔ یہ ایک آگ ہے۔ جو ایک بار روشن ہو جائے تو ریشے ریشے میں سرایت کر جاتی ہے۔ جو بجھنا نہیں جانتی۔ محبت دل کے چور دروازوں سے داخل ہو کر کبھی رخصت نہیں ہوا کرتی۔

لیکن تمہاری محبت محبت نہیں تھی۔ تمہاری محبت "ہوس" تھی تمہارا

بیار آندھی کی طرح اُمڈا۔ آناً فاناً میں چھا گیا۔ اور طوفان کی طرح چُپ
چاپ اُتر گیا۔

اختر! تم نے مجھے ساری زندگی خون کے آنسو بہانے کے لئے
چھوڑ دیا ہے۔

میں تمہیں کبھی نہیں بھُول سکتی۔ کاش! —— میں تمہیں بھُول
سکتی!

میں تمہیں یُونہی بے فائدہ خط لکھ رہی ہوں۔ جو تمہیں کبھی نہ بھیجوں
گی۔ میں ایسے ہی کئی کئی خط لکھ کر پھاڑ چکی ہوں ——

اب تمہیں خط لکھنے کا کیا فائدہ!

آج کا دن ایک عجیب اُداسی میں گزرا۔ پہلی پہلی دھوپ اور آسمان پر چھائے ہوئے گہرے غبار نے سارے ماحول کو غمگین بنا رکھا ہے۔ بدلیوں میں پھیکے سے دھندلے دن کو۔ جب بادلوں کے مٹیالے ٹکڑوں نے سورج کو ڈھانپ رکھا ہو۔ اور چاروں طرف غبار کا گہرا خول ہو۔ تو نہ جانے! ایسے سمے دل کیوں اُداس ہو جاتا ہے۔!

روح کسی بوجھ کے نیچے دبی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ساری دنیا غمگین نظر آتی ہے۔ جیسے کسی چیز میں بھی حسن۔ دل کشی اور رعنائی نہیں رہی۔ میرے لئے تو ویسے بھی اس دنیا میں نہ کوئی خوشی رہی ہے اور نہ حسن رہا ہے

—— اب تو میں اختر کو بھی بھلا رہی ہوں ؛

آج میں دوپہر کو کھانا کھا کر اُدھر گئی ۔ اور ابھی بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ امیؔ نے آوازیں دیں ——

میں نے پوچھا ۔ کیا ہے ؟ تو کہنے لگیں ۔ تمہاری سہیلی کی نوکرانی آئی ہے ۔

مَیں نے کہا ۔ ادھر ہی بھیج دو ۔

اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی ۔ کہ وہ آسیہ کے ہاں سے آئی تھی ۔

میرا دل دھڑکنا شروع ہو گیا ۔ میرا حلق خشک ہو گیا ۔ پھر اُس

نے بتایا۔ کہ چھوٹے صاحب بہت بیمار ہیں۔ انہیں بیمار ہوئے بیس روز ہو گئے ہیں۔ اور اُنہوں نے آپ کو بُلایا ہے۔

اِس خبر نے مجھے شعلے کی طرح مضطرب کر دیا! میرا جی چاہتا تھا۔ کہ اگر اختر بیمار ہے۔ تو اُس کی تیمارداری کرنے کا حق صرف مجھی کو ہے۔ میرا جی چاہتا تھا۔ بھاگ کر جاؤں۔ اور اختر سے لپٹ جاؤں ——

وہ میری زخمی محبت جس کا گلا اس نے بے رحمی سے گھونٹ ڈالا تھا۔ آج پھر ایکا ایکی بے چین ہو گئی۔ روشنی کے مینار کی مانند میرے تاریک سمندر میں اُبھر آئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اُسی پُرانی محبت نے جس کا میں نے اپنے طور پر خاتمہ کرنا چاہا تھا۔ اُس نے یہ خبر سنتے ہی میرے سارے جسم کو ایسے جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ جیسے گرمیوں میں طوفان چیڑھ کے جنگل سے گزر کر آگے نکل جاتے ہیں میں بہت پریشان ہو گئی۔

اختر نے کس بے رحمی سے مجھے یادوں کے خزاں نصیب جنگلوں میں تنہا چھوڑ دیا ہوا تھا۔ جہاں اُس کی ہر بات ایک مستقل قہقہہ اور مذاق

بن کر چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں اس جنگل میں تنہا اور ماری ماری پھرتی رہی ہوں۔ بنجر اور تپتے ہوئے ریتیلے صحراؤں میں دھنسی ہوئی تھی۔ میں نے وہ دِن کس طرح بسر کئے تھے؟ میں نے وہ سال کس مشکل سے گذارا تھا۔!

اختر تم نے مجھے کس بُری طرح مصیبتوں کے اِس وسیع صحرا میں تن تنہا چھوڑ دیا۔ کیا تمہیں ذرہ خیال نہ آیا تھا؟ تم نے اپنے کئے ہوئے وعدوں کا ایک لمحہ کے لئے بھی خیال نہ کیا ــــ

تم نے وعدوں کے سارے سفینے ڈبو دئے۔ اور تم ثمینہ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ تم ثمینہ کے خیال ہی سے وہ سارا کچھ بھول گئے۔ جب تم نے میرے ساتھ مل کر آسمان کی لازوال وسعتوں میں خواب دیکھے تھے۔ اور ستاروں کی وادیوں میں پہنچ کر محبت کے گیت گائے تھے۔ تمہاری محبت پانے کے بعد میں نے اپنی زندگی کے مرغزاروں میں اُن پھولوں کو سنہری دھوپ میں کھلتے اور مہکتے دیکھا تھا۔ جو اس سے پہلے کبھی نہ کھلے تھے۔ جو اس سے پیشتر کبھی نہ مہکے تھے۔

ہم محبت کرتے تھے —— اور تم نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا مگر جب ثمینہ کو تمہارے سامنے پیش کیا گیا۔ تو تم نے مجھے چھوڑتے وقت پل بھی نہ لگایا۔ تم نے مجھے ایک لمحہ میں ہی گہری کھڈ میں گرادیا۔

اُس کی نوکرانی کھڑی تھی۔ اور میں خیال ہی خیال میں کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی تھی ——

پھر میں ایک دم خیالوں سے چونک پڑی۔ اور اُسے کہا۔ تم جاکر کہہ دو میں نہ آسکوں گی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اور وہ چلی گئی۔

اُس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک روتی رہی۔ میں کیوں اُسے ملنے جاؤں؟ میرا اور اُس کا اب کیا ساتھ!

وہ رنگ محل میں رہتا ہے۔ اور میں وہاں رہتی ہوں۔ جہاں خاک اڑتی ہے ——

زندگی میرے لئے ایک سنگین خفیفت بن کر رہ گئی ہے۔ اور اُس کے لئے محض ایک مذاق ہے —— میرے ہر سمت اُداسیوں

کے کھنڈرات سلسلہ در سلسلہ پھیلتے چلے گئے ہیں۔ اور اُس کے گرد خوشیوں کے راگ ہیں ——

میں وہاں ہوں۔ جہاں کوئی آواز نہیں۔ کوئی گیت نہیں کوئی زندگی نہیں۔ وادیوں کا سورج ڈوب چکا ہے۔ پرندے گنگ ہو گئے ہیں۔

اب میں جا کر کیا لوں گی! —— لیکن نہیں —— میں جاؤنگی۔ اختر بیمار ہے۔ میں اُسے دیکھنے ضرور جاؤں گی ——

یا خدا! آج کا دن جلدی سے گزار دے۔ تاکہ میں کل جا سکوں اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے ہیں۔ اب نہ جا سکوں گی —— کل جاؤں گی ؂

ساری رات نہیں سو سکی ــــ اختر کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی ہوں۔

آج میں اُسے دیکھنے ضرور جاؤں گی ــــ جو رات جاگ کر دُکھ کی گزاری جائے ــــ وہ کس قدر لمبی رات ہو جاتی ہے! سو سال کی رات ہو جاتی ہے ــــ

یُوں لگتا تھا۔ جیسے کبھی صبح نہ ہو گی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ صبح ہو گئی ہے ؎

آج میں اختر سے ملنے گئی۔ ایک طویل مدت کے بعد اُن کے
ہاں گئی تھی ـــــ
اختر کے کمرہ میں گئی۔ وہ کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ اور کمرہ میں اور
کوئی نہ تھا ـــــ
میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوئی۔ کُرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اب میں
سوچ رہی تھی۔ اُسے اُٹھاؤں کیسے ؟
کیا کمبل کھینچوں ! لیکن اگر کوئی اور ہوا تو ؟
کیا اس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دوں ! ـــــ

لیکن میں خاموش بیٹھ گئی۔ بالآخر میں اُٹھی۔ اور سرہانے کی طرف جا کر جھک کر دیکھنے لگی۔ کہ اختر ہی ہے۔ یا کوئی اور ہے؟

اور جونہی میں جھکی۔ اختر نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ پکڑ لیا۔ اور میرا منہ اپنے منہ کے پاس لے گیا ـــ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی میں نے زبردستی اُس کے ہاتھ ہٹا لئے۔ اور وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا ـــ میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کہ وہ اچھا بھلا تھا۔ بالکل بیمار نہیں تھا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گیا تھا ـــ

اُس کو تندرست اور صحت مند دیکھ کر میرا جی اُداس ہو گیا۔ افسردہ ہو گیا ـــ اور میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی! کہ کاش! یہ بیمار ہوتا! پھر میں اس کی تیمارداری کر سکتی۔ اسے ملنے کے لئے آ سکتی ـــ

اور اب! پھر شاید اسے میری محبت کا خیال آتا ـــ

اختر مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا ـــ میں سوکھ کر آدھی سے بھی زیادہ کم ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اختر کے پاس پہنچکر مجھے رونا آ جاتا۔ اُس نے صرف اتنی سی بات کہی۔ کہ یہ تم نے اپنا کیا

حال بنا رکھا ہے۔

اور میں پھُوٹ پھُوٹ کر رونا شروع ہو گئی!

مجھے خیال آجاتا ہے۔ کہ یہی تو وہ شخص بیٹھا ہے جس نے مجھے برباد کیا ہے۔ میری اداسی۔ میری تباہی —— میری غمگینی۔ میری کمزوری ہر چیز کا باعث صرف یہی شخص ہے۔ اسی شخص کی محبت ہے۔ جس نے میری زندگی کو دُکھ میں بدل دیا ہوا ہے۔ اور اب یہی شخص مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ کہ تجھے کیا ہوا؟ ——

کیا یہ رونے والی بات نہیں ہے؟

اِس کے بعد بڑی مشکل سے اختر نے چُپ کرایا۔ بہت پیار کرنے لگا۔ بڑی باتیں کیں۔ کہنے لگا۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور ہمیشہ کروں گا۔

اور میں نے ابھی تک منیرہ سے بھی شادی نہیں کی۔ میں وہاں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو صرف تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ تم جو میری محبت ہو ——

اِس کے بعد پھر اختر ایک بار مجھے ورغلانے لگا۔ کہنے لگا۔

میں تمہاری محبت کو آزمانا چاہتا تھا ـــــ یہ دیکھنا چاہتا تھا ـــــ
کہ تم آتی ہو یا نہیں ـــ اور اگرچہ تم نے کل انکار کہہ دیا تھا۔ مگر مجھے
پتہ تھا۔ تم آؤ گی۔

میں خاموش بیٹھی اُس کی باتیں سُنتی رہی۔ میرے پاس اِن
باتوں کا کیا جواب تھا!

اُس نے کہا۔ وعدہ کرو۔ تم اپنی صحت کا خیال رکھو گی۔

اور یہ سُنکر مجھے رونا آ گیا ـــــ اختر کو بھلا میرا درد کیسے آ گیا!
اس کی بے دردی نے تو مجھے دکھ دیا ہے۔ اور اب یہی میرا درد کر رہا ہے!
یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے ـــــ نہ نہ اختر! تم میرا درد نہ کرو تم صرف
ظلم کرو۔ یہی تمہیں اچھا لگتا ہے۔

اختر نے بتایا۔ کہ وہ اپنی امی کو منا رہا ہے۔ کہ وہ یہاں شادی
کرنا چاہتا ہے۔

اور اگلے ہفتے تک اِس بات کا فیصلہ ہو جائیگا۔ اُس کی اِس بات
نے مجھے حیران کر دیا ـــ پھر اختر نے وعدہ لیا۔ کہ میں اگلے ہفتے
معلوم کرنے ضرور آؤں +

یہ ہفتہ ایک عجیب قسم کے موڈ میں گزرا ہے۔ عجیب کشمکش و پیچ میں۔ کبھی آس بندھ جاتی تھی کبھی نا اُمیدی ہو جاتی تھی۔ کبھی یہ خیال آجاتا تھا۔ کہ شاید وہ میری حالت دیکھ کر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

لیکن اگر اُس کے دل میں چاہ نہیں ہے۔ تو پھر میں یہ شادی نہیں کروں گی۔

میں تو شادی سے زیادہ یہ چاہتی ہوں۔ کہ وہ مجھ سے اور

صرف مجھ سے محبت کرے ۔ بے شک شادی نہ بھی ہو ۔

شاید وہ میری حالت پر رحم کھا رہا ہے ؟ ــــــــــ

خدا نہ کرے ۔ اگر ایسی بات ہوئی ۔ تو میں کبھی شادی ہی نہیں کروں گی ۔

میں اُس کا رحم نہیں چاہتی ۔ مجھے رحم سے نفرت ہے ۔ اگر اُس نے مجھ پر رحم کیا ۔ تو میں سختی سے ڈانٹ دوں گی ۔

میں کوئی فقیرنی ہوں ۔ جو وہ مجھ پر رحم کر کے مجھے خیرات دے ! ؞

پرسوں اختر کے ہاں جانا ہے۔ پتہ نہیں۔ وہ کیا بتائے گا؟
خدا کرے ۔ وہ مجھے بہت بڑی خوش خبری دے!
پھر میں اختر کے پاس ہمیشہ رات دن رہوں گی۔ پھر جدائی کے
یہ ہولناک دن جتنے میں نے گزارے ہیں۔ اِن سب کی تلافی ہو جائیگی!
پھر دُنیا کتنی خوبصورت ہو جائے گی؟ ــــــ پھر ہر چیز
چمک اُٹھے گی۔ یا خُدا ــــ کیا تُو میری اِتنی سی آرزو بھی پُوری
نہ کرے گا؟ ☸

کل کی چاندنی رات کس قدر خوبصورت تھی۔ ذرّے ذرّے
سے حُسن چشمے کی مانند پھوٹا پڑتا تھا —— نیلی نیلی بے داغ چاندنی
چاروں طرف بچھی جا رہی تھی ——
چاندنی کسی خوبصورت دوشیزہ کی طرح چپ چاپ لیٹی ہوئی
تھی —— ہر چیز پر سحر انگیز کیفیت طاری تھی ——
میں مسحور سی ہو کر اختر کے متعلق سوچ رہی تھی ؛ یہ کس قدر
خوبصورت رات ہے! جب شہروں کی گلیوں کے اندر یہ خوبصورت
رات ہے۔ تو پہاڑوں اور جنگلوں پہ یہ رات کیا حسین نہ ہو جاتی

ہوگی! میں ان پہاڑوں اور جنگلوں میں کب جاؤں گی۔ جہاں ایسی خوبصورت چاندنی ہوگی! ایسی خوبصورت راتیں تو سوکر نہیں بسر کرنی چاہئیں۔

میرا جی چاہتا ہے۔ میں چاندنی راتوں کا سارا حُسن اپنی جھولی میں سمیٹ لوں۔ ہائے! میں تو اِس کی شیدائی ہوں ——

ایسی راتوں میں بس یہی جی چاہتا ہے۔ کہ چاندنی میں نہلائے ہوئے خوبصورت باغوں میں جاکر رقص کریں۔ خوب اچھلیں۔ کودیں اور گائیں۔ شور مچائیں۔ اور آنکھ مچولی کھیلیں۔

مگر ایسا کہاں ہو سکتا ہے!

ان جگہوں پر رہ کر ایسا سوچنا اور ایسے رنگین خواب دیکھنا لوگوں کے نزدیک محض حماقت ہے۔ مگر میرے دل سے ایسی باتیں الگ نہیں ہوتیں۔ بے شک چاہے یہ حماقت ہی کیوں ہو! *

آج میں اختر کے ہاں گئی۔ تو اختر گھر پر نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد
آیا۔ اور اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اختر نے تعارف کرایا:

یہ ہے مس ثمینہ! میری پھوپھی کی لڑکی۔

اور یہ ہے مس زاہدہ سُلطانہ۔ آسیہ کی سہیلی۔

ثمینہ چہک کر سامنے صوفے میں جا دھنسی ——— اُس نے
فیروزی رنگ کی ساڑھی باندھی ہوئی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے ہونٹوں
پر گہرے سُرخ رنگ کی لپ سٹِک لگی ہوئی تھی ——— بالکل خون کے
رنگ کی۔ جیسے ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آئی ہے ——— جیسے اس نے

میرا ہی خون پیا ہے۔ میرے ارمانوں کا خون۔

میں خاموش زرد اور اُداس چہرہ لیئے بیٹھی تھی ——

اور اختر کبھی میری طرف دیکھتا تھا۔ اور کبھی ثمینہ کی طرف ——

ثمینہ شرما کر اُسے دیکھ رہی تھی۔ ادائیں دکھا رہی تھی —— اور اختر اُس پر نچھاور ہو رہا تھا ——

کچھ دیر کے بعد میں نے اختر سے اجازت مانگی۔ کہ مجھے اب جانا ہے۔

ثمینہ نے کہا۔ کہ کچھ دیر بیٹھو۔ مگر میں کاہے کے لیئے بیٹھتی۔

میں اُٹھ کر آ گئی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اگر اختر نے ثمینہ سے ہی شادی کرنی تھی۔ تو پھر اُس نے مجھے آج بلایا کیوں؟ ——

مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اختر مجھے بیوقوف بنا رہا تھا —— ثمینہ کو دکھا کر یہ کہنا چاہتا تھا —— دیکھا —— میں جس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کیسی ہے؟ ——

ہاں! اختر سچ کہتا ہے۔ محبت یونہی نہیں کی جاتی ——

ایسی محبت میں آنسو نہیں بہائے جاتے —— بلکہ آنکھوں

میں EYE LASHES لگا کر آنکھوں کو خوبصورت بنایا جاتا ہے
تاکہ دیکھنے والے کو اچھی طرح گھائل کیا جا سکے ــــ
ایسی محبت کرنے کے لئے ریشمی ساڑھی اور کٹے ہوئے بالوں
کی ضرورت ہے ــــ
نازوادا کی ضرورت ہے ــــ دولت کی ضرورت ہے۔ آسودگی
اور خوشحالی کی ضرورت ہے۔ رشتہ داری کی ضرورت ہے ــــ لیکن
یہاں بھلا کیا ہے ؟
ثمینہ وہاں رہتی ہے۔ جہاں پھول کھلتے ہیں ــــ جہاں سکّے
کھنکتے ہیں۔ جہاں ریشمی ساڑھیاں ہیں ــــ
مگر ہم وہاں رہتی ہیں۔ جہاں رُک رُک کر بہنے والے آنسو ہوتے
ہیں۔ غریبی ہوتی ہے۔ اور باسی پھولوں کے ہار ہوتے ہیں ــــ
کل تک اختر مجھے کہتا تھا۔ کہ ہمارا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ اور
آج وہ ثمینہ سے کہہ رہا ہوگا ــ مجھ سے پہلے اور نہ جانے کس کس کو کہتا رہا
ہوگا۔ اور نہ جانے کب تک کہتا رہے گا ؟
کیا اختر اس قدر گھٹیا ہے !

مَیں نے جس اختر کو تاج محل کا سنگِ بنیاد سمجھا۔ وہ تو سڑک پر پڑا ہُوا پتھر نکلا ـــــ اُس کی محبت کا قطب مینار سنگین چٹانوں پر نہیں بلکہ ریت کی بوریوں پر تعمیر ہُوا تھا۔ اِن لوگوں کے لئے محبت تاش کے پتّوں کی طرح ہے۔ جسے ہر ایرے غیرے میں بانٹتے پھرتے ہیں۔

ساری رات میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سوسکی۔ میری ساری روشنیاں میری آخری آس ہر چیز گُل ہوگئی تھی ـــــ رنگوں کے دیپک بجھ گئے تھے۔ روشن چاند ٹکڑے ٹکڑے ہوکر نامعلوم تاریکیوں میں جا چھُپا۔

اور میں اپنے آپ کو اِس قدر نڈھال محسوس کر رہی تھی جیسے ابھی گِری کہ گِری۔

بُت بنی بیٹھی ہوں ـــــ پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھتی ہوں۔ نہ جانے کیا ہوگا؟ یہ صدمہ کیسے بھولے گا!

رات سے پھر بہت تیز بخار ہو گیا ہے ـــــ منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکالا جاتا ـــــ دادا جان کہہ رہے تھے ـــ میری بیٹی کو نہ جانے کس کی نظر کھا گئی ہے ـــــ

میرے دادا! کیا تُو مجھ سے پیار کرتا ہے! کیا تُو واقعی مجھے بیٹی سمجھتا ہے؟ ـــــ تو اس بیٹی کو زہر لا کر دے دے۔ کہ یہ مصیبتوں سے چھوٹ جائے!

بخار اُترتا ہی نہیں ۔ نہ زور کا چڑھتا ہے ـــــــ نہ رات کو نیند آتی ہے ۔ ذرا سا پڑھ لوں ۔ تو دماغ تھک جاتا ہے ۔

امی رات دن پریشان رہتی ہیں ۔ کہ نہ جانے اُن کی بیٹی کو کون سا گھُن لگ گیا ہے ۔

مگر امی کو کیا پتہ ؟!

زندگی کتنی عجیب ہو گئی ہے ؟ ـــــــ

کل میں ڈاکٹر کے ہاں سے واپس آرہی تھی۔ تو راستے میں اختر کا نوکر مل گیا۔ اُس نے بتایا۔ کہ اختر بابو کی شادی اگلے اتوار کو ہو رہی ہے ——

اِس خبر نے مجھے پاگل سا بنا دیا —— بڑی مشکل سے ڈاکٹر کی دوکان تک پہنچی۔ اور یوں نڈھال ہو کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ جیسے طوفان سے ٹوٹی ہوئی شاخ درخت ہوتی ہے۔ وہاں پر بے شمار عورتیں آئی ہوئی تھیں۔ مگر مجھے کسی کا کچھ علم نہیں۔ کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ میرا رنگ لیموں کی طرح زرد تھا۔ اور میری آنکھ میں کوئی آنسو نہیں تھا۔ یوں

لگتا تھا۔ جیسے میرا کلیجہ کوئی کھا رہا ہے۔ دل ڈوب رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سرد تھے۔ اور جسم گرم تھا۔

بڑی مشکل سے گھر آئی۔ ڈاکٹر کی دوائی پی۔ اور بے سُدھ ہو کر پڑ رہی۔

اے نیلے آسمانوں پر بسنے والے خدا! میری دُنیا تباہ کر کے تیرے ہاتھ کیا آیا؟

کونسی خوشیاں مفت دے دی تھیں۔ جن کی قیمت لینی تھی؟
اگر ظلم کی انتہا کرنی ہے۔ تو پھر مجھے اپنے پاس بلا لے۔

آج اختر نے شادی کا کارڈ بھیجا ہے۔ کہ اگر مجھے اُس سے محبت ہے۔ تو میں اس کی شادی میں ضرور آؤں۔

او ظالم اور بے وفا شخص! کیا تو چاہتا ہے۔ کہ میں اپنے جنازے میں خود ہی شریک ہونے آؤں؟ —— کیا میں اپنے سامنے تیری شادی ہوتے دیکھ سکتی ہوں! تجھے یہ کارڈ بھیجتے ہوئے بھی کوئی خیال نہیں آیا! ——

تم میرا سہاگ مجھ سے چھین کر مجھے کفن پہنا رہے ہو! تم سارے لوگ پتھر ہو۔ تم بھی ایک پتھر ہو۔ مجھے ان پتھروں نے چاروں طرف سے

گھیرا ہوا ہے۔ بہت جلد یہ سارے پتھر پھٹ جائیں گے۔ ریت چاروں طرف پھیل جائے گی۔ اور یہ آندھی نہ جانے مجھے کہاں اڑا لے جائیگی۔

میں ریت کے اِس طوفان میں نہ جانے کہاں کھو جاؤں گی۔ میرے بہن بھائی اور میری والدہ نہ جانے مجھے کہاں ڈھونڈتی پھریں گی۔ میں ان کو کہاں ملوں گی؟

آہ! میرا ایسا غم نہیں۔ جسے میں بھول سکوں گی۔ یہ اُسی اختر کی شادی ہو رہی ہے۔ جس نے مجھے اپنی زندگی۔ اپنی جان کہا تھا۔ جس نے کہا تھا۔ زاہدہ! تم میرے جسم کا خون اور میرے پھول کی خوشبو ہو۔ تمہارے بغیر میں کبھی زندہ نہیں رہ سکتا! آہ! میں کس قدر بھولی تھی اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔

مگر وہ تو لفظوں کا سوداگر تھا۔ لفظوں کے مینا بازار سجا کر مجھے راستے میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

مَیں نے زندگی بھر کا سودا چند جھوٹے اور کھوٹے سکوں سے بھی کم تر اور گھٹیا لفظوں پر یقین کر کے کر لیا۔ وہ تو کہتا تھا۔ کہ میں تمہیں حاصل کرنے کے لئے ہر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر مول لے لونگا۔

اور پھر وہ مجھے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیتا۔ اور کہتا۔ کہ کوئی مجھے تم سے الگ نہیں کر سکتا ـــــ میں گھبرا جاتی تھی میرا سانس رک جاتا تھا۔ مگر وہ مجھے نہیں چھوڑتا تھا ـــــ اُس کے اس رویّہ سے مجھے ڈر آتا تھا۔ کیونکہ اس طرح پیار کرتے ہوئے اُس کی شکل بدل جاتی تھی۔ وہ کوئی ایسا خونی درندہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ابھی ایک پل میں مجھے کھا جائے گا۔ اور میں سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اُسے تکتی تھی ـــــ

اور جب میں اُسے کہتی۔

اختر! یہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ تمہارا جسم ہانپنے کیوں لگ جاتا ہے۔ تمہیں بخار کیوں ہو جاتا ہے۔

تو وہ کہتا۔ تم نہیں جانتیں۔ میں تم سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں اور جی چاہتا ہے تمہیں اپنے اندر اُتار لوں۔ یا خود تمہارے اندر چلا جاؤں ـــــ چند روز کے بعد جب تم میری بیوی بن جاؤ گی۔ تو پھر تم دیکھنا۔ جو میں نے ایک پل کے لئے بھی تمہیں چھوڑا۔ اِس لئے کہ میں تم سے لازوال محبت کرتا ہوں۔ اور تم میری بیوی بننے والی ہو۔ میں

تمہارا مالک اور شوہر ہوں۔

مگر اب وہ ثمینہ سے شادی کر رہا ہے —— کیا مرد کی محبت بھی ہوتی ہے ——

اُس نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی سے کھیلا۔ اور جب دل بھر گیا تو لاپرواہی اختیار کرلی۔

مرد کی محبت جب لڑکی کو چھو لے۔ تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔

اختر مجھ سے کبھی بھی محبت نہ کرتا تھا۔ بلکہ وہ تو ایک عورت ایک جسم کو چاہتا تھا۔ اب اُسے ایک اور جسم مل گیا ہے۔ ایک خوبصورت جسم۔ ریشمی ساڑھیوں میں لپٹا ہوا —— وہ اُسے بیوی کے روپ میں ملے گا —— وہ مجھ سے لاپرواہ ہو گیا ہے۔

بس۔ اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے۔ اختر نے مجھے جس قدر خوفناک دھوکہ دیا ہے۔ جس بلندی سے گرایا ہے۔ میں اُسے کبھی معاف نہ کروں گی۔ خدا اس سے ضرور بدلہ لے گا —— اُس نے ایک ایسا دل توڑا ہے جو ہمیشہ سے دکھی تھا۔ دکھی دل محبت کا بھوکا ہوتا ہے۔ اِس لئے میری محبت عظیم محبت تھی —— مگر اختر نے پاؤں تلے کچل ڈالا ؏

کل امی پانی کا اتنا بڑا گھڑا اٹھا کر اوپر لا رہی تھیں۔ کہ سیڑھیوں پر پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ سیدھے نیچے جا گریں۔

گرنے کا دھماکا ہوا۔ اور میری تو جان ہی نکل گئی۔ میں بستر کو چھوڑ کر بھاگی ——— دادا جان بھی گھر پر نہیں تھے۔ ساتھ کی ہمسائی کو بلایا۔ اور امی کو اٹھا کر ادھر لائے۔ ان کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اور آنکھیں بند تھیں۔ نسیمہ نے رونا شروع کر دیا۔ انجم گھر پر نہیں تھا۔ میرا دل بھی بہت تیزی سے دھڑکا۔ کہیں میری امی کو تو نہیں کچھ ہو گیا۔

بڑی دیر کے بعد امی کو ہوش آئی ——— میری طرف دیکھا

اور پھر آنکھیں بند کر لیں ———

ایک پل میں ہی میری آنکھوں کے سامنے سے کئی تصویریں

گزریں۔

مگر میں نے ایسے منحوس خیالوں کو اپنے پاس تک نہ پھٹکنے

دیا۔

اور رات گئے تک امیؔ کو سینک کرتی رہی۔ گرم دودھ پلایا۔ رات

کو دادا جان آئے۔ تو ڈاکٹر سے دوائی لائے ؏

اپنی بیماری مجھے بھُول گئی ہے۔ اور امی کی تیمارداری میں مصروف
ہو گئی ہوں ——— امّی بہت بیمار ہو گئی ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کیا ہونے
والا ہے؟ ——— یا خدا! ہم پر رحم کرنا ———
اچھے خدا! ہم پر اپنا کرم کرنا ——— ہم سے ہماری امی کو نہ لینا۔
میری جان لے لے۔ مگر امی کو آرام دے دے۔
راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں مانگتی ہوں۔
یا خدا! ہمارا قصور معاف کر دے ؛

———

امی سے کروٹ تک نہیں بدلی جاتی ـــــ بہت زیادہ کمزور ہوگئی ہیں۔ ان کو بیمار رہتے ہوئے ایک مہینہ ہوگیا ہے۔ مگر آرام نہیں آتا۔ مجھے بھی بخار رہتا ہے۔ مگر میری امی کو آرام آجائے ـــــ

نہ گھر میں کھانا پکتا ہے۔ نہ کوئی ہنستا ہے۔ بازار سے دونوں وقت کچھ نہ کچھ آجاتا ہے۔ میرا تو کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ صرف نسیمہ اور انجم اور دادا جان کے لئے منگا لیتے ہیں۔

یا خدا! تُو امیر لوگوں سے ڈرتا ہے۔ اُن کو کچھ نہیں کہتا۔ مگر تُو نے ہم پر کیوں اتنا ظلم کرنا شروع کر رکھا ہے۔ پہلے تُو نے ابا کو چھین

لیا۔ اور اب تو امی کو آرام نہیں دیتا۔

یا خُدا! میری جان لے لے۔ یا خدا! آج ہی لے لے مگر میری ماں کو آرام دے دے۔

میرے خدا! میری امی کیلئے کہ ہم پر اور زیادہ ظلم نہ کرنا ——!

ہمارے پاس اتنا روپیہ بھی نہیں ہے۔ کہ شاندار طریقے پر امی کا علاج کرائیں۔

ڈاکٹر بھی دس روپے فیس لئے بغیر نہیں آتا —— اتنے اتنے قیمتی انجکشن وغیرہ کہاں سے منگائیں؟!

مگر امی کو ضرور بچانا ہے۔

کیا میں اختر کو بتاؤں؟

لیکن نہیں — یا خدا! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے خواہ مخواہ اُس کا نام لے لیا۔ وہ ہمارا کچھ نہیں لگتا۔ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا لوں گی۔ مگر اُسے کبھی نہ کہوں گی۔ کہ امی بیمار ہے۔

نجمہ کو خط لکھوں! مگر ایک عرصہ سے اُس کا بھی خط نہیں آیا

—— نجمہ کو کیسے لکھوں! ——

کاش! وہ یہاں ہوتی!

میں اپنی ایف۔ اے کی کتابیں بیچ ڈالوں گی۔ مگر اُس سے کیا ہوگا؟!

یا خدا! تُو میری ماں کو آرام دے دے۔ ورنہ ہم سب کو مار ڈال اکٹھے ہی ہم سب کو اِس دُنیا سے اٹھا لے۔ اپنی اس دنیا سے —— جہاں ہم دکھ اُٹھانے کو زندگی گزار رہے ہیں ؛

آج امیّ کی طبیعت بہت خراب ہے ۔ ساری رات چارپائی کے ساتھ لگی امیّ سے نظر بچا کر روتی رہی ہوں —— پاگل ہو گئی ہوئی لگتی ہوں —— امیّ کے بعد ہمارا کیا بنے گا ؟ ——

میری امیّ جان ! میری پیاری امی جان —— اپنی آنکھیں کھول دے —— دیکھ میری امی ۔ تیری زاہدہ بیٹی تجھے بُلا رہی ہے !

تُو نے تو ابھی اس کی شادی کرنی ہے —— ابھی تو انجم اور نسیمہ نے بھی بڑا ہونا ہے ——

میرے خدا ! میری فریاد سُن ۔ میری دعا قبول کر ×

امّی کی حالت دِن بدن خراب ہوتی جارہی ہے۔ دادا جان خاموشی سے آتے ہیں۔ اورچپ چاپ بیٹھ جاتے ہیں۔ اب نہ وہ گالیاں دیتے ہیں۔ نہ کسی سے بولتے ہیں۔ پہلے سے زیادہ بوڑھے ہوگئے ہوئے لگتے ہیں ــــــ

دادا جان کے ایک ایک کرکے پانچ جوان بیٹے مر گئے۔ پھر تین بیٹیاں مر گئیں۔ اور اب ــــ ان کی بہو ــــ بسترِ علالت پر دراز ہے ــــ

یارب العزت! اے پاک پروردگار! اے بلند معبود۔ آسمانوں پر بسنے والے خدا ــــ میری ماں کو آرام دیدے۔ ہماری مصیبتوں میں

ہزار بار اضافہ کر دے۔ مگر ماں کو آرام و بدے۔ کیا تُو نہیں جانتا۔ کہ ماں کے بغیر ہم کیسے زندگی بسر کریں گے ؟

اور اگر تجھے نہیں پتہ۔ تو پھر ہم کو پتّھر کر دے۔ ہم سب کو پتّھر کر دے۔ ہم سب کو اپنے پاس بلا لے۔ ہم نے تیری دنیا میں رہ کر کیا کرنا ہے ؟

یا خدا! ہم تیرے کھلونے ہیں۔ تو ہم سب کو ستاتا رہتا ہے۔ جو تیرا جی چاہتا ہے۔ تُو کرتا ہے۔ تُو امیروں سے ڈرتا ہے۔ ان کو کچھ نہیں کہتا ——

مارے ہم کو —— جو جی چاہے کرلے ——

تُو نہ جانے کب سُنے گا ؟ ——

امی کو وفات پائے ایک سال گزر گیا ہے۔ اور مجھے سینی ٹوریم میں آئے چھ ماہ ہو گئے ہیں ـــــ مگر پہلے سے زیادہ ہی بیمار ہوگئی ہوں۔ پہلے تو صرف ایک پھیپھڑا چھلنی ہوا تھا ـــــ اب دوسرا بھی ہو رہا ہے ـــــ

ڈاکٹر تسلیاں دیتے ہیں۔ مگر میں اُن کی جھوٹی تسلی سُن کر ہنس دیتی ہوں ـــــ میں جانتی ہوں۔ میں کتنے روز کی مہمان ہوں۔

اور اب جبکہ میں دن بدن مرنے کے قریب ہوتی جا رہی ہوں۔ نہ مجھے کوئی دُکھ رہا ہے۔ نہ غم رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں بہت

جلد امّی اور ابّا کے پاس جانے والی ہوں ـــ دادا جان پہلے ہی پہنچ چکے ہیں ـــ صرف ایک غم ہے ـــ میری نسیمہ بہن اور انجم بھیّا کا کیا بنے گا ؟

وہ لائل پور میں خالہ کے پاس رہتے ہیں۔ وہ یہاں رہ نہیں سکتے ـــ

اِن تین چار سالوں میں ہم پہ کیا کچھ نہیں بیتا ؟ مگر گلہ کیسا ؟ اب کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے۔ کسی سے نہیں ہے۔ نہ خدا سے نہ دنیا والوں سے۔

اختر بھی نہ جانے کہاں ہوگا ؟

آہ ! مَیں نے اُس پھول سے پیار کیا ۔ جس کی خوشبو میں کبھی نہ سونگھ سکی ۔ اور اُن راستوں پہ بیٹھی ۔ جہاں سے اختر کبھی نہ گزرا ۔

شام کی اُداسی چاروں طرف چھا رہی ہے سینی ٹوریم کی اس اداس شام کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا ـــ اور پھر آج کل تو خزاں کا موسم ہے جس کی وجہ سے فضا اور بھی اُداس اور تاریک نظر آتا ہے درخت پتّوں سے خالی ہوتے جا رہے ہیں ـــ

سامنے کے درخت سے زرد زرد پتے ایک ایک کر کے
گرتے رہتے ہیں —— جیسے یہ میری یادیں ہیں - جو ایک ایک کر کے
میری زندگی کے درخت سے جھڑتی رہتی ہیں —— اور جب یہ درخت
بالکل خالی ہو جائے گا - تو میں مرجاؤں گی —— میں دنیا کی باتیں -
یادیں سارا گھر یہیں چھوڑ جاؤں گی -

دُور سیاہ پہاڑیوں کے پیچھے زرد آفتاب غروب ہو رہا ہے
ابھی کچھ دیر کے بعد چاند کالی کالی ٹہنیوں کے پیچھے سے نکل آئیگا -
اور میری ختم ہوتی ہوئی زندگی کا ایک اور روز کم ہو جائے گا - ایک
دن اور بیت جائے گا - موت کی گھڑی اور قریب آجائیگی ——
اب مجھے موت سے بالکل ڈر نہیں لگتا - موت میری سہیلی ہے -
موت ہی مجھے اپنے گھر میں پہنچا دے گی - ایسے گھر میں جہاں
میرے ابا اور میری امی میرا انتظار کر رہے ہوں گے - میں اپنی امی
اور ابا کے پاس اپنے گھر میں رہنا چاہتی ہوں - یہاں اس دنیا
میں میں بالکل اکیلی ہوں —— پھر میں یہاں کیسے رہ سکتی ہوں!
جوں جوں موت کے قریب ہوتی جاتی ہوں - اختر سے ملنے

کی خواہش بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر میں اُسے نہیں ملوں گی۔ مجھے کیا خبر
کہ وہ کہاں ہے؟

وہ زندہ ہو گا ——— اور زندگی کی ہر خوشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہو گا
——— دنیا میں ایسے ہی لوگوں کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ خدا
نے انہیں لوگوں کے لئے زندگی بنائی ہے ———

ورنہ وہ ہمارا گھر یوں نہ اُجاڑتا ———

پہلے ہمارے آبا کو لے لیا پھر غریبی دیدی۔ پھر امّی کو لے لیا پھر
دادا جان کو۔ اور اب میری باری ہے۔ کچھ روز کے بعد نسیمہ اور انجم کی
بھی باری آجائے گی۔ اُن دونوں کو بھی بچا رہنا ہے۔ کاش! یہ دونوں
میرے سامنے مرجاتے ———

دونوں خالہ کے پاس رہتے ہیں۔ جو رات دن اُن سے کام
لیتی ہو گی۔ اور کھانے کو کیا دیتی ہو گی! ——— میں تو چاہتی ہوں۔ کہ
خالہ زیادہ سے زیادہ ظلم کرے۔ تاکہ یہ جلد سے جلد ہم سے آن ملیں۔
نہیں ان کو دنیا میں غیروں کے گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی! میں ان کو ساتھ
لے جانا چاہتی ہوں۔ جن بچوں کے والدین دنیا میں نہ رہیں۔ دنیا اُنہیں

اپنے پاؤں تلے کچل ڈالتی ہے۔ اپنے ظلم کا نشانہ بنا ڈالتی ہے ــــ

یہ دُنیا میں ظلم کے لئے کیوں زندہ رہیں ؟

میری معصوم کلیو! میرے بہن بھائیو! میرے قریب آجاؤ۔ ان

دنوں میں تو میرے پاس رہو۔

روزانہ ڈائری لکھتی ہوں ــــ ڈاکٹر سے چھپ چھپ کر۔

آدھی سے زیادہ ڈائری کھو گئی ہے ــــ

کاش! میں تندرست ہو جاتی ــــ تو اپنی داستان خود لکھتی۔

مگر ــــ اب نہیں لکھ سکتی ــــ جو لکھا تھا۔ وہ بھی آدھے سے

زیادہ کھو چکا ہے۔ میرے مرنے کے بعد سب لوگ ان کو پڑھیں گے۔

شاید کسی کو اختر کا پتہ چل جائے ــــ اور وہ بھی جان لے ــــ

پہچان جائے ــــ

لیکن اگر اُسے پتہ بھی چل گیا۔ تو کیا ہوگا؟ اُسے تو جیتے جی میری

پرواہ نہ ہوئی۔ تو اب کیا ہوگی؟

آہ! ــــــــ!!

سینی ٹوریم میں بستر پر لیٹے لیٹے جب کھانستے کھانستے نڈھال
ہو جاتی ہوں۔ تو اُٹھ کر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ دُور دُور تک
بستر پر مریض پڑے ہوتے ہیں ——
کبھی کبھی سوچنے لگ جاتی ہوں —— کہ نہ جانے اِن
میں سے کتنوں کو دق کس وجہ سے لگی ہو گی !! ——
پھر جی چاہتا ہے۔ اِن سب سے اِن کے حالات پوچھوں
اور اُن سب کو لکھوں۔ اور پھر دُنیا والوں کے سامنے پیش کروں۔
کہ دیکھو — تمہارے ظلم کے نشانے کہاں کہاں تک جا کر پہنچے ہیں۔

کیا پتہ اِن میں سے کئی لڑکیوں کو محبت کی وجہ سے دِق ہوئی ہو۔
کیا خُدا اُن سے خون کا یہ بدلہ لے گا! —— یُوں کوئی کسی کو
قتل کر دے۔ تو فوراً پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔ مگر اِس طرح ہزاروں
لوگوں نے ہزاروں لڑکیوں کو —— لڑکوں کو ظلم کر کرکے اندر ہی اندر گھُن
لگا کر موت کے گھاٹ پہنچایا ہوا ہے۔ ان کا بدلہ کیوں نہیں لیا جاتا!
ظلم کرنے والوں کو سزا کیوں نہیں دی جاتی! یہ کیسا اندھا انصاف
ہے!! ——

اور خدا سارا کچھ دیکھتا ہے۔ اور چپ رہتا ہے۔ خاموش رہتا
ہے ؂

ڈاکٹر اشفاق روزانہ آتا ہے۔ کس قدر ہنس مکھ اور مہربان ڈاکٹر ہے ــــ مجھے کتنی تسلی نہیں دیتا ــــ مجھ سے کتنی کتنی دیر تک باتیں کرتا رہتا ہے۔ میرا جی بہلاتا ہے۔ وہ مجھے ٹھیک کرنے کی ہر ہر کوشش میں مصروف ہے۔

لیکن میں کیسے ٹھیک ہو سکتی ہوں؟ ــــ میں اُسے کیا بتاؤں ــــ کہ اختر کا غم مجھے کھا گیا ہے۔ ایک مرد نے غم دیا ہے اور دوسرا مرد غم کو مندمل کر رہا ہے ــــ دیکھیں کون کامیاب ہوتا ہے۔ اختر کا غم بھاری رہتا ہے۔ یا ڈاکٹر اپنی کوششوں میں کامیاب رہتا ہے۔

ڈاکٹر مجھ سے کہتا ہے کہ اپنے دل کی ہر

ہر بات مجھے بتا دو۔ مگر میں کیسے بتاؤں ؟ ـــــــــ میں کبھی نہ بتاؤں گی۔ اب یہ راز میرے منہ سے نہیں نکل سکتا۔ ہاں۔ اگر وہ میری یہ ڈائری پڑھ لے۔ تو پڑھ لے۔

لیکن یہ بے ربط ڈائری ـــــــــ کسی کو بھلا اس کی کیا سمجھ آئے گی ؟ ــ

اور پھر اگر کسی کو سمجھ آ بھی گئی۔ تو کوئی محسوس کرنے والا ہی محسوس کرے گا ـــــــــ عام لوگ بھلا کیا سمجھیں گے ـــــــــ

کل یہاں ایک لڑکا آیا۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ آیا تھا۔ اُس کی بہن کی سہیلی یہاں بیمار ہے۔ اُسے دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ اُس کی شکل بالکل اختر سے ملتی ہے۔

اور میں اُس کے جانے کے بعد رات گئے تک روتی رہی بغیر آنسوؤں کے روتی رہی۔ اب میں آنسوؤں سے تو کبھی نہیں رو سکتی۔ اب بغیر آنسوؤں کے روتی ہوں۔

شاید وہ کل پھر آئے۔ وہ ضرور آئے۔ میں اُسے ضرور دیکھنا چاہتی ہوں ؛

آج اُس کی بہن آئی ہے۔ مگر وہ نہیں آیا۔ کیا میں اُسکی بہن سے پوچھوں؟
لیکن نہیں۔ میں کسی سے نہیں پوچھتی۔ میں کسی سے نہیں پوچھوں گی۔

جب زندگی ختم ہو رہی ہو۔ اور موت کا سفر شروع ہونے والا
ہو۔ تو ایسی باتوں سے کیا فائدہ؟

یہاں کے اکثر بیمار مجھ سے پوچھتے ہیں۔ کہ تم کو ملنے والا کوئی نہیں
آتا۔ اور میں ہنس دیتی ہوں۔ میں ان کو کیا بتاؤں؟ کہ مجھ سے ملنے کے لئے
کس نے آنا ہے؟ مجھ سے ملنے والے تو اس جہان میں پہنچ چکے ہیں۔
جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا —— اب اُن سے ملنے کے لئے میں
اُن کے ہاں جاؤں گی —— اختر کو کیا ضرورت پڑی ہے۔ کہ وہ یہاں آئے۔

اے دُنیا والو! میں بہت جلد تم کو الوداع کہنے والی ہوں۔ یہ بخار
اور یہ کھانسی —— یہ مجھے چند دنوں کے بعد ختم کر دیں گی —— پھر
میں آسمانوں کی طرف چلی جاؤں گی —— نہ جانے دوسری دنیا کیسی ہو گی!

افسوس! ڈاکٹر اشفاق نے جس طرح میری تیمارداری اور خدمت کی ہے میں نے اُس کا حق بالکل نہیں دیا۔ چند لمحوں کیلئے بھی دل سے غم کو دُور نہیں کیا۔ میں اُس کا ساتھ کیونکر دے سکتی ہوں؟! یہاں سے نکل کر میں اِس بھری دنیا میں اور کہاں جا سکتی ہوں! ——— لوگوں کے لئے بھری — مگر میرے لئے خالی دُنیا! پھر میں کیونکر اُس سے تعاون کر سکتی تھی! ؎

آج وہ لڑکی اور وہ لڑکا پھر آیا تھا ——— میں کمبل کی اوٹ سے کتنی ہی دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔ بالکل اختر کی طرح لگ رہا تھا ———

کہیں یہ اختر کا بھائی ہی تو نہیں ہے؟ ——— اختر کہا کرتا تھا — کہ میرا ایک بھائی بالکل میری طرح ہے۔ جتنی کہ اتنی شکل ملتی ہے کہ لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے — مگر اُس نے یہاں کیا کرنے آنا ہے؟ ؎

آج کا دن کتنی خوشی کا دن تھا! آج مَیں نے اپنی سہیلی نجمہ کو دیکھا ہے ——

وہ مجھے دیکھ کر رونے لگ پڑی —— اس کے پاس ابھی آنسوؤں کا ذخیرہ موجود ہے۔ خدا کرے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو کبھی نہ بہیں۔ میری آنکھ سے اب ایک بھی آنسو نہیں نکل سکتا۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی ——

کتنی مہربان ہے! کتنا افسوس کرتی تھی۔ کہ تمہاری یہ حالت کیسے ہو گئی؟

اور مَیں نے اُسے کہا۔ تمہیں پھر بتاؤں گی ؏

——

اور پھر کھانسی شروع ہو گئی۔ اور کوئی بات نہ ہو سکی نجمہ روزانہ

آتی ہے۔

مجھ سے بات تک بھی نہیں ہو سکتی۔ وہ طرح طرح کی باتیں کر کے

میرا جی بہلاتی ہے۔ ڈاکٹر سے باتیں کرتی رہی۔ مگر ـــــ میں بھلا

کیسے ٹھیک ہو سکتی ہوں؟ ـــــ

نجمہ نے بتایا ـــــ کہ باجی کی شادی کے بعد اب اُس کی شادی

ہونے والی ہے۔ اور وہ چاہتی ہے ـ کہ میں جلد جلد اچھی ہو جاؤں۔

تاکہ اُس کی شادی میں آ سکوں

نجمہ کتنی بھولی ہے۔ بہت زیادہ !!

بھلا میں کبھی ٹھیک ہوسکتی ہوں !!——

آج اُس کے جانے کے بعد میں تقریباً نیم بے ہوش سی پڑی رہی۔

اور یہی سوچتی رہی — کہ ہم لوگوں میں اور اِن لوگوں میں کیا فرق ہے؟

ہم نے کون سا گناہ کیا تھا۔ جس کی سزا یہ مل رہی ہے، کہ میں

سینی ٹوریم میں سسک سسک کر جان دے رہی ہوں۔ اور انہوں نے

کون سی نیکی کی تھی۔ کہ امن۔ خوشحالی اور خوبصورتی کی زندگی گزار رہی

ہیں۔ اور اب اِس کی شادی بھی ہوگی! یہ کس کا ہاتھ ہے۔ جس نے

اُسے خوشی بخشی ہوئی ہے۔ اور ہمیں دُکھ !——

اِس راز کو کہاں سے پاؤں !—— ؟

آج میری حالت زیادہ خراب ہے۔ آج یوں لگتا ہے جیسے
زندگی کی آخری رات ہے ——

کاش! میں اپنے بہن بھائیوں سے مل سکتی! پھر شاید میں
مرنہ سکتی۔!

کتنا اچھا ہو۔ جو میں مرنے سے پہلے بے ہوش ہو جاؤں۔ میں یہ
ڈائری وغیرہ نجمہ کے نام کر کے اُسے بھجوا دوں گی۔

میرا دل ڈوب رہا ہے۔ اور آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں ؎

———

زاہدہ کی ڈائری پڑھنے میں مَیں اِس قدر محو ہوئی تھی۔ کہ مجھے وقت کا پتہ ہی نہ چلا ــــ اور جب مَیں نے ڈائری بند کر کے رکھی۔ تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ پڑی ــــ

اور پھر چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

سارے گھر والے اکٹھے ہو گئے تھے۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہی۔

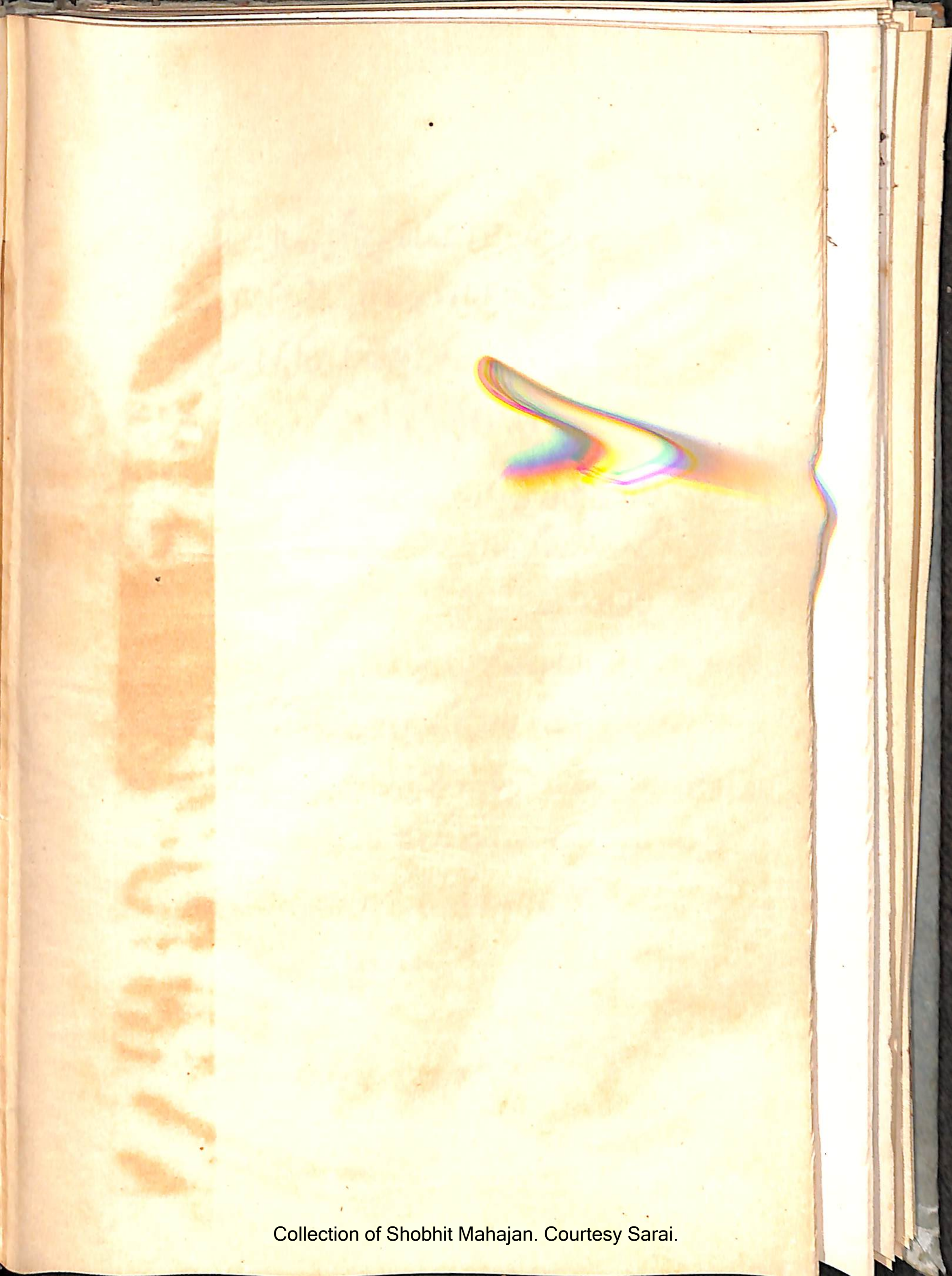
تین روز کے بعد مجھے ہوش آئی۔ تو اختر میرے پاس بیٹھا ہوا تھا ــــ

مَیں نے اُسے دیکھ کر مُنہ نفرت سے دوسری طرف پھیر لیا۔ میرا جی چاہتا تھا۔ کہ میں اِس شخص کو زندگی بھر نہ دیکھوں ــــ

یہ اختر میرا منگیتر جس کے ساتھ میری منگنی دو سال سے ہو گئی ہوئی تھی ——
ثمینہ سے اختر کا بیاہ نہ ہو سکا تھا —— ثمینہ کی ماں نے شادی سے
چار روز پہلے وہ طوفان کھڑا کیا تھا۔ کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔
جب میں زاہدہ کی ڈائری پڑھنے کے بعد بے ہوش ہوئی تھی۔
تو ڈائری کھلی کی کھلی پڑی رہ گئی تھی —— اور میرے بے ہوش ہونے
کے بعد سارے گھر والوں نے اسے پڑھ لیا تھا —— اختر نے بھی پڑھ
لیا تھا ——

اور اب وہ مجرم بنا بیٹھا تھا ——
سب گھر والوں کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کوئی کسی کو کیا کہے؟ ——
اور یہ اختر تھا —— جو سینی ٹوریم میں جاتا رہا تھا —— مگر افسوس
—— کہ زاہدہ سے بات نہ کر سکا ——
کاش! زاہدہ ایک بار اس سے بات کر لیتی!! ؏

کتبہ۔ محمد شریف عباسی خوشنویس۔ گجرات۔ جنوری ۱۹۵۵ء





انشاء پریس لاہور